شوبنا نجھاوان*
صفدر رشید (مترجم)**

# ہندی، اردو یا ہندوستانی؟ نو آبادیاتی عہد کے دورِ آخر میں آل انڈیا ریڈیو پر ہونے والے قومی زبان کے مباحث: ایک بازدید

# Hindi, Urdu, or Hindustani? Revisiting 'National Language' Debates through Radio Broadcasting in Late Colonial India

## Abstract:

The paper titled "Hindi, Urdu or Hindustani? Revisiting 'National Language' debates through radio broadcasting in late colonial India" deals with an old controversy surrounding Urdu and Hindi but appears fresh and unique in its attempt to narrow it down to the language controversy debates to the extent of All India Radio. The study is also significant because it discusses not just the language politics of that era but also sheds light on the real problems faced by radio producers and professionals working in that scenario. The study finds that despite the intensity of debate to progress towards a national language for the would-be nation in the post-British (withdrawal) situation, the divisions on the issue of language continued to become harder, with serious societal and political repercussions. The translator has added a detailed introduction and furnished with many annotations and footnotes.

**Keywords:** All India Radio, Urdu, Hindi, Hindustani, British India. Codification, Standardization of Language, National Language.

### تمہید (از مترجم)

اس بات پر علمائے لسانیات کا اختلاف نہیں کہ زبان کا تعلق بنیادی طور پر بول چال سے ہے، نہ کہ تحریر سے اور یہ کہ ایک ہی زبان ایک سے زیادہ رسم الخط میں تحریر کی جا سکتی ہے۔ نو آبادیاتی دور میں ہندوستان میں زبانوں کو رومن رسم الخط میں لکھنے کا رجحان تو آیا، مگر ایسی مثال ہندوستان تو کیا شاید دنیا میں ہی کوئی ملے کہ ایک زبان دو رسم الخط میں

تحریر کیے جانے کے باعث دھیرے دھیرے ایک تنازعے کا باعث بنے اور دیکھتے ہی دیکھتے دو جداز بانوں کے ہونے کا دعویٰ سامنے آئے۔ یہ بھی اپنی نوعیت کا انوکھا واقعہ ہے کہ اس سارے عمل کا پس پردہ محرک مذہب ہے۔ اگر زبان کی بنیاد صَرف، نحو اور قواعد پر ہے تو اردو اور ہندی دو جداز بانیں کس طرح ٹھہریں؟

اس الجھے ہوئے موضوع کو ڈاکٹر گیان چند کی کتاب ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب نے مزید الجھا دیا۔ گزشتہ صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں یہ موضوع اپنے عروج پر تھا۔ اس کا ایک سبب آزادی کے بعد ممکنہ قومی زبان کے سوال سے نبٹنا بھی تھا۔ لہٰذا اس مسئلے نے ایک ہمہ گیر صورت اختیار کی اور ادیبوں اور دانشوروں کے ساتھ ساتھ مذہبی اور سیاسی طبقہ بھی میدان میں اتر آیا۔ اس وقت کے بڑے سیاسی قائدین میں سے شاید ہی کوئی ہو جو اپنی رائے کا اظہار ایک یا دوسری شکل میں نہ کر رہا ہو۔ جناب زیڈ۔ اے۔ احمد (۱۹۰۸ء-۱۹۹۹ء) نے ان مباحث کو اپنی مرتبہ کتاب *National Language for India: A Symposium* میں جمع کر دیا، جس سے اس موضوع پر اس وقت کی ایک تصویر سامنے ابھرتی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی، جس کا اردو رُوپ قومی زبان کے نام سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے ۲۰۰۱ء میں سامنے آیا۔ اس انتخاب میں تئیس صاحب الرائے حضرات کی تقاریر یا تحاریر شامل ہیں جن میں مہاتما گاندھی (۱۸۶۹ء-۱۹۴۸ء)، نہرو (۱۸۸۹ء-۱۹۶۴ء)، راجندر پرساد (۱۸۸۴ء-۱۹۶۳ء)، مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء-۱۹۶۱ء)، ڈاکٹر ذاکر حسین (۱۸۹۷ء-۱۹۶۹ء) اور دھیرندر ورما (۱۸۹۷ء-۱۹۷۳ء) جیسے نام بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور راجندر پرساد کے آل انڈیا ریڈیو پر نشر ہونے والے مضامین بھی اس کا حصہ ہیں۔

اردو-ہندی تنازعے پر بہت لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے۔ اس مسئلے کی جڑیں بہ ہر حال نوآبادیاتی ہندوستان میں ہیں، اس طرح اسے محض لسانیاتی اور علمی تناظر میں نہیں سمجھا جا سکتا۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد کے دور کو خصوصاً باغ و بہار اور پریم ساگر کے تراجم کے بعد کی صورتِ حال کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی اور ۱۹۴۰ء کی دہائی کے ابتدائی سال اس حوالے سے نہایت اہم ہیں کہ اردو-ہندی جھگڑے کا ایک اور پہلو سامنے آیا اور وہ تھا کہ نوآبادیاتی ہندوستان اور پھر آزادی کے بعد ممکنہ قومی زبان کیا ہو۔ خیال رہے کہ یہ زمانہ قومیت کی بحثوں کے لحاظ سے بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔

ہندوستان کی مرکزی زبان کے حوالے سے اب نوآبادکار بھی فریق تھے، کیوں کہ وہ اپنی جگہ مشکل میں تھے اور اس کا کوئی منطقی حل ڈھونڈنا چاہتے تھے۔ ہندوستان کی مرکزی زبان کے تعین کے لیے انھوں نے ''ہندوستانی'' کی

اصطلاح مناسب سمجھی اور ایک لحاظ سے یہ درست بھی تھی، جیسے جرمن، فرانسیسی، جاپانی، وغیرہ۔ ہندوستانی کا لفظ خاص طور پر گل کرسٹ نے برتا۔ گاندھی نے بھی ایک اور زاویے سے لفظ ''ہندستانی'' کی وکالت کی کہ اگر ہماری مشترکہ زبان اردو نہیں کہلا سکتی تو کم از کم ایک ایسا نام تو اس کا ہونا ہی چاہیے جس سے اندازہ ہو کہ اس زبان کو وضع کرنے میں مسلمانوں کا بھی خاص حصہ ہے اور یہ کم و بیش مشترکہ عناصر کی حامل ہے۔ لفظ ''ہندستانی'' یہ شرط پوری کر سکتا ہے ''ہندی'' نہیں[۱]۔

اس بحث میں ایک نیا موڑ اس وقت آیا جب ۱۹۲۳ء میں پہلے بمبئی سے اور پھر ۱۹۲۷ء میں کلکتہ سے ریڈیو نشریات کا آغاز ہوا۔ یہ نشریات نجی ریڈیو کلب کی جانب سے تھیں۔ ۱۹۳۰ء سے اس کا دائرہ کار بڑھا کر حکومتی دائرے میں لایا گیا اور اسے انڈین اسٹیٹ براڈکاسٹنگ سروسز کا نام دیا گیا اور ۱۹۳۶ء سے اس کا دائرہ عمل کم و بیش پورے ہندوستان میں پھیل گیا اور اس کا نام آل انڈیا ریڈیو ہو گیا۔ مرکزی یا قومی زبان کی بحث کے حوالے سے ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کا قیام نہایت اہم ہے۔

ریڈیو کی اثر انگیزی کو بہت جلد پہچان لیا گیا۔ نو آبادکاروں یا ہندوستان کے قوم پرست سیاسی رہنما سب نے اس میں پوشیدہ ایک بڑا امکان بھانپ لیا۔ پروگراموں کے مواد سے زیادہ اہمیت زبان کے میڈیم کو دی جانے لگی۔ ریڈیو پروڈیوسر اپنے پروگراموں میں جس ''ہندوستانی'' کو برت رہے تھے، ایک پڑھا لکھا طبقہ اور سیاسی رہنما اس پر معترض تھے کہ یہ دراصل اردو ہی ہے اور یوں سامعین کی ایک بڑی تعداد کے لیے تقریباً ناقابلِ فہم۔ مختصر یہ کہ آل انڈیا ریڈیو نے بالواسطہ طور پر ایک ایسا سٹیج فراہم کر دیا جہاں ہندوستان کے لیے ایک مرکزی زبان کی ضرورت، اس کی مشکلات اور ممکنہ حل کے لیے متنوع تجاویز سامنے آئیں۔ ستم ظریفی یہ کہ سب کے لیے ایک قابلِ قبول مشترکہ زبان کی طرف بڑھنے کے بجائے ان بحثوں نے اردو اور ہندی کے بیچ خلیج کو مزید واضح کیا۔ اس مضمون کے حوالے سے یہ بات پیشِ نظر رہے کہ اس کا سروکار اردو-ہندی تنازعے کو کلیت میں دیکھنا نہیں اور نہ ہی اس مسئلے پر اپنی رائے دینا ہے، اس کا دائرہ کار قوم پرستی کی فضا میں آل انڈیا ریڈیو پر قومی زبان کے حوالے سے ہونے والے مباحث سے ہے۔

شوبنا نجھاوان کا تحقیقی مضمون نو آبادیاتی ہندوستان میں قومی زبان کے مسئلے پر آل انڈیا ریڈیو کے کردار کو بہت باریکی سے دیکھتا ہے۔ آپ ٹورنٹو کی یارک یونیورسٹی کے شعبہ زبان، ادب اور لسانیات میں ہندی کی ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ قومیت، اردو اور ہندی کے حوالے سے ان کے مقالات منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

مقالے میں Hindustani اور Indian کے الفاظ برتے گئے ہیں، اول الذکر زبان کے حوالے سے اور

مؤخر الذکر خطے کے حوالے سے۔ Indian کا ترجمہ بھی ہندوستانی ہے، لہٰذا جب یہ بطور زبان برتا گیا اس پر واحد واوین لگا دیے گئے، تا کہ فرق قائم کیا جا سکے۔

**تعارف**

اوائل بیسویں صدی میں جنوبی ایشیا کی مختلف مقامی زبانوں میں بہت سے جرائد اور نثری اور شعری اصناف کی اشاعت ہوئی۔ ان کے مخاطب نہ صرف تعلیم یافتہ مرد قارئین تھے بلکہ نو آبادیاتی ہندوستان کی آبادی کے دیگر طبقے بھی تھے۔ مثال کے طور پر ۱۹۳۰ء کی دہائی تک متوسط طبقے کی خواتین اور بچوں کو نئے قارئین کے طور پر بہ خوبی شناخت کر لیا گیا تھا؛ وہ اس ''موزوں'' ادب کی طلب رکھتے تھے، جسے ہندی کے معروف لکھاریوں نے بہ طور خاص ان کے لیے تصنیف کیا ہو[۲]۔ وسیع معنوں میں ہندی ادب کے متوقع قارئین، صرف اسی ترقی پسند اور شہری متوسط طبقے پر مشتمل نہیں تھے، بلکہ ان سے ہٹ کر بھی تھے۔ تیزی سے سیاست زدہ ہوتے ماحول میں، دیہی اور شہری ان پڑھ آبادی نے بھی (ہندی) قوم پرست لکھاریوں اور سیاسی رہنماؤں کی توجہ حاصل کی۔ انھوں نے مقامی دانش ور (Intelligentsia) طبقے کے ساتھ مل کر ابلاغ کے، تقریری، زبانی اور اشاعتی ذرائع کی مدد سے عوام تک رسائی کی کوشش کی۔ زبان اور اس کا پیرایۂ اظہار، شناخت سے متعلق ابلاغ کا ایک نازک ذریعہ بن گئے، جو لوگوں کو جوڑتے اور تقسیم کرتے تھے۔ ریڈیو نشریات پر ہونے والی بحث، جو زبانی اور تحریری صورتوں کے کہیں بیچ وجود رکھتی تھی، غیر معمولی طور پر متنوع سامعین کو ایک ایسی زبان میں ''موزوں'' علم فراہم کرنے سے متعلق تھی، جو نہ صرف سہل اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہو بلکہ، فرضی طور پر سہی، ایک نمائندہ زبان بھی ہو۔ اسے نہ صرف ہندی زبان و ادب کے قومیانے بلکہ ہندی اور اردو کے دو علیٰحدہ ادبی زبانوں کے طور پر معیار بندی، تدوین (codification) اور ادارہ جاتی بنانے جیسے بڑے سوالات میں سمویا جا سکتا ہے۔

زیرِ نظر مقالہ نو آبادیاتی ہندوستانی ریڈیو کی نشریات کے کردار کی تحقیق، اس مخصوص سیاق میں کرتا ہے۔ اس مقالے کا مئوقف ہے کہ پروگرام ترتیب دینے، زبان اور لسانی معاملات پر ہونے والے [ریڈیائی] مباحث نے اس امر پر غور کرنے اور ان امکانات وحدود کی تشکیل میں مدد دی کہ کس طرح قومی زبان، جنس، عمر، ذات / طبقے، مذہبی اور دیہی / شہری کے فرق کو پاٹ سکتی ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ بحث ۱۹۴۰ء کی دہائی کے نو آبادیاتی، ہندو ثقافتی اور ہندی کے ادبی اور لسانی ڈسکورس کے نتیجے میں دم توڑ دیتی ہے، زیر نظر مقالہ یہ دکھاتا ہے کہ نشریات کی اصل زبان (جو چھپی ہوئی صورت میں دستیاب ہے) اور اس زبان سے متعلق مباحث کا تجزیہ، ہمیں ایسے اشارات فراہم کرتا ہے، جن کی مدد سے ہم ان پیچیدگیوں کو (اور امکانات وحدود سمیت) سمجھ سکتے ہیں جو ایک تصور کی گئی قومی زبان کو، اس وقت کی زیر تشکیل قوم کی حقیقی زبان بنانے میں حائل تھیں۔ [قومی زبان کی] اس بحث میں شامل بعض لوگوں کی طرف سے جس زبان کا سرِ عام مطالبہ کیا گیا، اسی کو در حقیقت ریڈیو نشریات میں آزمایا گیا اور اس زبان کا اظہار بہت حقیقی انداز میں

ہوا۔

ریڈیو کی نشریات ایک خود مختار قوم پرستانہ سرگرمی نہیں تھی، بلکہ یہ باضابطہ طور پر حکومتِ ہند کے صنعت و محنت کے شعبے کے تحت تھا[۳]۔ اس کے باوجود ہندی قوم پرست پڑھے لکھے طبقے اور فاضل افراد نے اس نئے وسیلے سے تعامل کرنا چاہا اور اس کی صورت گری کرنا چاہی[۴]۔ اس تعامل کو لکھنؤ کے ہندی ادبی رسالے سُدھا (Sudha)[۵] میں ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا ریڈیو کے لکھنؤ اسٹیشن کے قیام کے بعد سے محفوظ کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریڈیو نشریات میں ہندوستانی سماج کے بڑے حصوں تک پہنچنے کی اہلیت تھی۔ اس نے ایک ایسے مرکز کے طور پر بھی کام کیا کہ جہاں اس امر کا کھوج لگایا گیا کہ ہندوستان اور اس کے عوام کی قومی زبان کیا ہونی چاہیے؟

ان مباحث میں جس مسئلے سے نپٹا گیا، اس کا کلیدی نکتہ یہ ہے کہ ریڈیو پروڈیوسروں کے نزدیک ''ہندوستانی'' دہلی اور لکھنؤ اسٹیشنوں کی نشریاتی زبان ہے۔ ریڈیو پر برتی گئی زبان اور سامعین کو مطلوب زبان میں نہ صرف فرق تھا بلکہ ریڈیو سامعین کے بارے میں ہندی اور اردو کے دانش وروں کے تصورات میں بھی مناسبت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ان اصطلاحات کے بارے میں وہ لسانی انتشار جو یورپی ماہرین لسانیات، برطانوی پالیسی سازوں اور نوآبادیاتی افسران نے دہائیوں میں پیدا کیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لفظ ''ہندوستانی'' بہت سے افراد کے لیے مختلف معنی کا حامل بن گیا۔ بعض کے لیے یہ ہندوستانی آبادی کی اکثریت کی زبان تھی، لہٰذا اس میں ایک قومی زبان بننے کی پوری صلاحیت موجود تھی، جب کہ دوسروں کے لیے یہ اردو زبان، جو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، کو تشخص کرنے کا ایک متبادل نام۔ تیسرے مؤقف کے مطابق ''ہندوستانی'' ترسیل کے لیے ایک بول چال کی زبان ہے، جو نوآبادیاتی صورتِ حال میں سامنے آئی[۶]۔ لیونل فیلڈن (Lionel Fielden ۱۸۹۶ء-۱۹۷۴ء) جو برٹش براڈکاسٹنگ کارپوریشن (بی بی سی) کا سابقہ خصوصی معاون تھا اور جس نے اگست ۱۹۳۵ء میں ہندوستان میں انڈین اسٹیٹ براڈکاسٹنگ سروس میں بہ طور کنٹرولر ذمہ داری سنبھالنی تھی، نشریات میں ان لسانی معاملات کی پیچیدگی سے لاعلم نہیں تھا۔ ہندوستان میں براڈکاسٹنگ کی ترقی کے موضوع پر اپنی تفصیلی رپورٹ میں اس نے آل انڈیا ریڈیو کے لیے ''ہندوستانی'' کے بارے میں ایک قطعی اور واضح مؤقف اختیار نہ کرنے کا انتخاب کیا۔ فیلڈن لکھتا ہے:

> ہندوستانی کی اصطلاح ''اردو'' اور ''ہندی'' دونوں کا احاطہ کر لیتی ہے، کیوں کہ ایسا کرنے سے یہ آل انڈیا ریڈیو کو بہت سی عملی مشکلات سے محفوظ رکھتی ہے۔ اگرچہ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ تنقید سے مکمل طور پر مبرا نہیں۔ گرامر اور نحو کے اعتبار سے ''اردو'' اور ''ہندی'' عملی لحاظ سے ایک جیسی ہیں اور دونوں میں ایک قابلِ قدر ذخیرہ الفاظ مشترک ہے، تاہم تین ایسے عناصر ہیں جو انھیں ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں۔ پہلا یہ کہ ہندی دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور اردو فارسی-عربی رسم الخط میں۔ دوسرا یہ کہ بہت سی تاریخی اور سماجی

وجوہ کی بناپر ہندی کو ہندوؤں اور اردو کو مسلمانوں سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ تیسرا یہ کہ اردو کے مصنفین اپنے ذخیرۂ الفاظ میں وسعت کے لیے عربی اور فارسی کی طرف مائل ہیں اور ہندی کے مصنفین سنسکرت کی طرف، لہٰذا یہ ممکن ہے کہ ایک انتہا پر کسی مسلمان کی فارسی / عربی حروف میں ایک ایسی تحریر ہو جس میں فارسی اور عربی الفاظ کی بھر مار ہو، اور دوسری انتہا پر ایک ہندو مصنف کی دیوناگری رسم الخط میں ایک ایسی تحریر ہو جو سنسکرت الفاظ سے بھرپور ہو۔ یوں ان دونوں کے درمیان خلیج اتنی وسیع ہو سکتی ہے کہ ایسا قاری شاذ ہی ہو سکتا ہے جو یکساں سہولت کے ساتھ دونوں کی تفہیم کر سکتا ہو اور بلاشبہ بہت سے ایسے افراد بھی ہو سکتے ہیں جو ان دونوں ہی کو سمجھنے سے قاصر ہوں، اگرچہ ان دونوں انتہاؤں کے بیچ بہت سی اقسام ہیں۔ بلاشبہ ہر قسم پر حتمی اور دوٹوک انداز میں ''ہندی'' یا ''اردو'' کا لیبل چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ نشریات میں ایسا کرنا مزید دشوار ہو گا کیوں کہ بولا گیا لفظ رسم الخط کی قید سے آزاد ہے جو ہندی اور اردو میں تفریق کی اہم ترین علامت ہے۔ اس طرح آل انڈیا ریڈیو کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں بچتا کہ ان دونوں زبانوں کو (اگر یہ واقعی دو زبانیں ہیں) ''ہندوستانی'' کہے اور یہ بات انفرادی سامعین پر چھوڑ دی جائے کہ وہ اپنے لیے فیصلہ کریں کہ سماعت کی گئی زبان کو کیا کہا جائے: ''ہندوستانی''، ''اردو'' یا ''ہندی''[۷]۔

بول چال اور ادبی زبان کے رجسٹروں اور موجودہ ہندی بولیوں کے بھرپور تنوع کو تسلیم کرتے ہوئے انیسویں اور ابتدائی بیسویں صدی کی زبان کی پیچ دار سیاست بلاشک وشبہ الفاظ، رسم الخط اور مذہبی شناخت جیسے سوالات کے گرد گھومتی تھی۔ یہاں فیلڈن[۸] کو قدرے طوالت سے اس لیے پیش کیا تاکہ ۱۹۳۰ء کی دہائی کے نوآبادیاتی عہد میں ہندی، اردو اور ''ہندوستانی'' کے تعلق کی پیچیدگی کے خدوخال واضح ہو سکیں۔ جیسا کہ دیگر اسکالرز کے علاوہ ڈیوڈ للی ویلڈ (David Lelyveld۔ پ:۱۹۴۱ء)[۹] اور وسودھا ڈالمیا (Vasudha Dalmia۔ پ:۱۹۴۷ء)[۱۰] نے بہت باریک بینی سے واضح کیا کہ نوآبادیاتی مقتدرہ کس طرح اٹھارویں صدی کے آخر سے ہی ''ہندوستانی'' عوام کے لیے ایک معیاری زبان ہونے کے امکان کی کھوج میں تھی۔ برطانوی مستشرق اور نوآبادیاتی پالیسی سازوں کے علاوہ ہندی اور اردو کے فاضلین بھی ان مباحث اور ''ہندوستانی'' کے حقیقی اظہار کے بارے میں پائے جانے والی الجھن میں برابر کے شریک تھے۔ اٹھارھویں صدی کے وسط ہی سے ثقہ بند اور ذوق و شوق رکھنے والے ماہرینِ لسانیات، بشمول جان۔ بی۔ گلکرسٹ (John Borthwick Gilchrist۔۱۷۵۹ء-۱۸۴۱ء)، ہوریس ایچ۔ ولسن (Horace Hayman Wilson۔۱۷۸۶ء-۱۸۶۰ء)، جارج اے۔ گریرسن (George Abraham Grierson۔۱۸۵۱ء-۱۹۴۱ء) اور ایس۔ ڈبلیو۔ فیلن (S.W.Fallon۔ ۱۸۱۷ء-۱۸۸۰ء)[۱۱] نے اس اصطلاح کی تعریف مختلف زاویوں سے کی۔ ان میں سے بعض افراد نے ''ہندوستانی'' کو بہ طور ''کیمپ جارگن'' یعنی مسلمان حکمرانوں کے ہندوستانی آبادی کے تال میل سے پیدا ہونے کے تصور کو مسترد کیا[۱۲]، جب کہ دیگر نے اس کی شناخت بہ طور ایک لنگوا فرینکا (رابطے کی زبان) اور ایک ادبی زبان کے کی[۱۳]۔ یہاں یہ اشارہ کرنا کافی ہے

کہ گلکرسٹ نے ۱۷۸۵ء میں انگریزی ہندوستانی لغت شائع کی اور ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں قائم شدہ فورٹ ولیم کالج میں "ہندوستانی" کے لیے ادارہ سازی اور اصول سازی کے لیے تحریک دی۔

انڈین براڈکاسٹنگ میں بی بی سی کے سربراہ ملازم (Employee incharge) فیلڈن کی طرف دوبارہ پلٹتے ہیں، جنھوں نے اپنے خیالات کو قلم بند کیا ہے کہ "ہندوستانی" کا بہ طور ایک لنگوا فرینکا اور ادبی زبان کے مباحث کا خاتمہ نہیں ہوا۔ مزید بر آں، ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کی دہائیوں میں ہونے والے مباحث میں بہت سے شرکا نے یہ نکتہ اٹھایا: مثلاً یہ کہ "ہندوستانی" کی تعریف کا انحصار بولنے والے کے پس منظر پر ہے"[۱۴]۔ یہ بات آل انڈیا ریڈیو نشریات کی زبان کے بارے میں بھی درست تھی کیوں کہ شمالی ہندوستان کے ہندی کے فاضلین نے اس پر کڑی تنقید کی تھی۔

**ہندی، اردو اور 'ہندوستانی': زبان کی سیاست کاری**

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں ہونے والے زبان کے مباحث میں ہندی کے فاضلین پوری طرح شامل تھے۔ ان حضرات میں سے ایک برج بھاشا کے شاعر اور جدید ہندی کے مصنف اور ایڈیٹر دلارے لال بھارگو (۱۹۰۰ء-۱۹۷۵ء) تھے۔ بہت سے معروف ہندی لکھاریوں کے ناشر ہونے کی حیثیت سے انھوں نے ۱۹۲۰ء-۱۹۳۰ء کی دہائیوں میں لکھنؤ کے ہندی عوام میں مرکزی حیثیت حاصل کر لی تھی اور وہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ اسٹیشن کے زبان پر ہونے والے مباحث میں شرکت کرتے تھے[۱۵]۔ بھارگو نے اکثر تنقید کی کہ لکھنؤ، دہلی اور لاہور کے اسٹیشن ڈائریکٹروں نے پروگراموں اور ریڈیو کے بارے میں ان کی تجاویز اور گزارشات کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ وہ اور دیگر ہندی دانش ور آل انڈیا ریڈیو پر ہونے والے واقعات سے لاتعلق نہیں تھے اور ان کی شریک مدیر اور بیوی ساوتری دیوی کو لکھنؤ اسٹیشن کے ڈائریکٹر کی جانب سے ہندی اور اردو کے دیگر اسکالرز کے ہمراہ مدعو کیا گیا تاکہ دہلی سے نشر ہونے والی خبروں پر ان کی آرا سامنے آسکیں۔ ایک ایسے ہی اجلاس میں آل انڈیا ریڈیو پر انھوں نے "ہندوستانی" میں نشر کی جانے والی خبروں اور گفتگوؤں کی شناخت بہ طور اردو کھڑی بولی کے کی، جس میں عربی اور فارسی سے الفاظ مستعار لیے گئے تھے، جب کہ سنسکرت کے ذخیرۂ الفاظ سے احتراز برتا گیا تھا[۱۶]۔ نتیجتاً بھارگو نے نشریات میں استعمال ہونے والی لغت کے لیے زیادہ لچک کا مظاہرہ کرنے اور tatsama[۱۷] الفاظ کی شمولیت کا مطالبہ کیا، جو نہ صرف ہندی سامعین بلکہ بنگالی، مراٹھی اور گجراتی بولنے والوں کے پڑھے لکھے متوسط طبقے کے لیے بھی قابل فہم ہوں۔ انھوں نے اس کا بھی مطالبہ کیا کہ tatsama الفاظ بہ شمول فارسی، عربی الفاظ اور چند انگریزی الفاظ کو ریڈیو لغت میں، جو کہ ۱۹۴۰ء کی دہائی میں تیار کی جارہی تھی، شامل کیا جائے تاکہ بہت سی ہندوستانی مقامی زبانوں اور انگریزی کا ایک ایسا آمیزہ تیار ہو جائے جس کی گرامر مشترکہ کھڑی بولی ہندی اور کھڑی بولی اردو پر مبنی ہوگی۔ یہ وہ رائے ہے جس کی وکالت اس وقت کے بہت سے سیاسی اور ادبی افراد کر رہے تھے[۱۸]۔

ریڈیو نشریات کی زبان پر ہونے والے مباحث کی تحقیق کے موضوع پر بنیادی ماخذ (کے انحصار) کا میر ازیادہ تر حصہ، دلارے لال بھارگو اور ہندی عوام کے ان معاون عاملین کا ہے، جو اگست ۱۹۳۸ء اور جولائی ۱۹۴۱ء کے درمیان ہندی ادبی رسالے سُدھا میں چھپتے رہے۔ لکھنؤ کی صحافت سے جنم لینے والے اس چھوٹے سے سیاق کے ساتھ میں نے آل انڈیا ریڈیو نشریات کی زبان کے حوالے سے ہونے والی قومی زبان کی بحثوں پر نئے سرے سے نظر ڈالی ہے۔ میں نے یہ سب اس وقت کی ممکنہ اور حقیقی زبانوں کے مابین تقابل کرنے کی نیت سے کیا۔ ہندوستانی نشریات کی تاریخ سے متعلق محققین نے زیادہ انحصار برٹش براڈ کاسٹنگ سروسز اور انڈین براڈ کاسٹنگ سروسز کے ذخائر میں رکھی گئی نہایت شاندار اور بہت بڑی تعداد میں موجود سرکاری رپورٹوں اور اس وقت کے برطانوی اور ہندوستانی ماہرین لسانیات کی فاضلانہ تحریروں پر کیا ہے[۱۹]۔ ایسا شاذ ہی ہوا کہ مذکورہ تحریروں میں مقامی زبانوں کے مآخذ اور زبان و لسانیات کی باریک تفاصیل و جزئیات پر نگاہ گئی ہو۔ اس مقالے کا مقصد برطانوی نوآبادیاتی حکومت کی آخری دہائی میں علاقائی ہندی ریڈیو اسٹیشن بنانے کے بارے میں کوئی تفصیل فراہم کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد زبان سے متعلق مباحث میں ریڈیو کو دی جانے والی اہمیت (کی وجہ) کا کھوج لگانا ہے، جس کی میں نے لکھنؤ کے ہندی فاضلین کے سیاق میں چھان بین کی۔ میری بحث ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے قیام کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ اسی دور کے سُدھا کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

حکومتِ ہند کے علاوہ ان مباحث میں شریک ہر فریق کے پاس ہندوستان میں نشریات کی بحالی اور ترقی کے بڑے بڑے منصوبے تھے[۲۰]۔ ریڈیو یہ ثابت کر چکا تھا کہ وہ وسیع پیمانے پر یورپ اور سلطنتِ برطانیہ [معلومات، خیالات، تفریحی مواد وغیرہ کا] میں ابلاغ کرنے کے امکانات رکھتا ہے[۲۱]۔ نہ صرف پورے برصغیر میں ریڈیو نشریات پھیلیں بلکہ یہ ہندوستانی آبادی کے بیشتر حصے کو متحد کرنے کا سبب بھی بنیں۔ لیونل فیلڈن، جسے برٹش براڈ کاسٹنگ سروسز نے نشریات کے ایک انتہائی ماہر اور پرعزم کنٹرولر کے طور پر ذمہ داری دی، نے ۱۹۳۶ء میں انڈین اسٹیٹ براڈ کاسٹنگ سروس کا نام تبدیل کر کے آل انڈیا ریڈیو رکھ دیا۔ ہندی ادبی حلقے میں بھی ریڈیو کے امکانات کو پہچان لیا گیا تھا۔ سُدھا میں نہ صرف ہندی کی بہ طور ادبی اور قومی زبان بلکہ عام آدمی کی بول چال کی زبان کی معیار بندی پر دھواں دھار بحث چھڑی۔

سُدھا میں شائع ہونے والے مباحث میں شریک بہت سے عاملین ہندوستانی قوم کے لیے ہندی اور ''ہندوستانی'' کی بول چال کی شکلوں کا تصوّر کس طرح کرتے تھے؟ انھوں نے کس طرح ہر علاقے کے پڑھے لکھے اور ان پڑھ دیہی اور شہری مرد اور عورت، نوجوان اور بوڑھے جیسے بہ ظاہر متضاد گروہوں (ریڈیو سامعین) کو اتحاد کی لڑی میں پرونا چاہا؟ نشر کی جانے والی زبانوں (ہندی اردو اور ''ہندوستانی'') کی سُدھا میں اشاعتِ مکرر کس طرح اس رسالے میں شائع شدہ ہندی کی دیگر تحریروں سے مختلف تھی؟ ریڈیو کی نشریاتی زبان پر توجہ مرکوز کرنے، اس کی معیار بندی کرنے اور قومیانے کی کوششیں عوام کی ''حقیقی'' اور ''ممکنہ'' لنگوا فرینکا میں

مصالحت کے گرد گھومتی ہیں۔ اس کا اندازہ اس وقت کے ہندی کے رسائل اور ادبی اداروں سے ہوتا ہے۔ اس طرح کی بحثوں کی قیادت وہ گروہ کر رہے تھے جو کھڑی بولی ہندی کے حامی تھے، مگر اس کے ساتھ ہی وہ کثیر لسانی علاقوں سے متعلق تھے جس سے وہ آگاہ تھے۔ اس مقالے میں جن طبقات پر تحقیق کی گئی ہے ان کا تعلق ضروری نہیں ہے کہ ناشرین، ایڈیٹروں، مصنفین اور سیاستدانوں کے ہندو-ہندی قوم پرست طبقے سے ہو۔ وہ زیادہ تر نو آبادیاتی شمالی ہندوستان میں سیاسی، ثقافتی اور ادبی حلقوں کی ہندو (مذہبی) اور ہندی (قوم پرست) بالادستی کے زیر اثر تھے۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں نو آبادیاتی انتظامی پالیسیوں کے تناظر میں جن علاقوں میں ہندی کی شناخت ہندی علاقے کے طور پر کی گئی ہے، وہاں اسے تعلیم کی زبان کی حیثیت دی گئی ہے، تاہم اس نے ۱۹۰۰ء تک بھی سرکاری مقامی زبان کا مقام حاصل نہیں کیا۔ فرانچیسکا اور سینی (Francesca Orsini) پہلے اس چیز کو برطانیہ کی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' پالیسی کا حصہ سمجھتے ہوئے مزید کہتی ہیں:

> تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہند-ایران اور ہندو اشرافیہ کے درمیان ثقافتی رقابت اور مفادات کے ٹکراؤ کی ایسی صورت تھی جس میں ''زبان'' مختلف سطحوں پر ہم آہنگی کی علامت کی حیثیت اختیار کر گئی جسے معاشرتی درجہ بندی میں اپنی اپنی حیثیت کے دفاع اور فروغ کے حوالے سے معاون سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا یہ کہنا درست ہو گا کہ نو آبادیاتی پالیسیاں جہاں ہندی اور اردو کی تشکیل اور ان زبانوں کے حسب نسب پر اثر انداز ہوئیں، وہیں دونوں زبانوں کے نظریہ ساز اور کرتا دھرتا، نو آبادیاتی افسران کے ایسے خیالات جو ان کے اپنے دعووں اور تصورات سے مطابقت رکھتے، کو سرکاری سند کا درجہ دیتے[۲۲]۔

زبان کی سیاست کاری کے بارے میں ایسا بیان خاص طور پر لکھنؤ کے ضمن میں مناسب ہے، جہاں صوبہ ہائے متحدہ (United Provinces)[۲۳] میں واحد آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن کھولا گیا۔ لکھنؤ ہند-ایران ثقافت اور اردو کتابوں کی اشاعت کے حوالے سے غیر متنازع مرکز رہا ہے؛ اشاعت کے حوالے سے نول کشور پریس، جو ۱۸۵۸ء میں قائم ہوا، خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے مالک منشی نول کشور (۱۸۳۶ء-۱۸۹۵ء) نے انیسویں صدی کے آخر میں ہندی کتابوں کی اشاعت کو تجارتی لحاظ سے سود مند پایا۔ ہندی کے سرکاری مقامی زبان کا مرتبہ حاصل کرنے سے بہت پہلے نول کشور اس کے سرپرست کے طور پر سامنے آئے[۲۴]۔ اعلیٰ پائے کے دو ہندی ادبی ماہناموں، مادھوری (۱۹۲۲ء-۱۹۵۰ء) اور سُدھا (۱۹۲۷ء-۱۹۴۱ء) کی اشاعت سے اس شہر کو ۱۹۲۰ء کی دہائی میں ہندی اشاعت کی دوسری لہر دیکھنے کو ملی۔ یہی وہ وقت تھا جب ان رسائل کے بانی مدیر اور گنگا پستک مالا، جو ۱۹۲۷ء میں قائم کیا گیا، اشاعت گھر اور اس کے ساتھ ہی گنگا فائن آرٹ پریس کے مالک دلاری لال بھارگو نے لکھنؤ اور اس کے اطراف میں ہندی لکھاریوں اور ہندی ادبی اور تعلیمی اداروں کے نیٹ ورک قائم کرنا شروع کیے۔ یہ وہ نیٹ ورک ہیں جو ریڈیو

ہندی پر ہونے والے ان ادبی مباحث کا فوری پس منظر فراہم کرتے ہیں جو ۱۹۳۰ء کے آخر اور ۱۹۴۰ء کے آغاز کی دہائیوں میں ہونے تھے۔

**آل انڈیا ریڈیو(لکھنؤ اسٹیشن)اور ہندی عوام**

۱۹۳۰ء کی دہائی کے آخر میں آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام پانچ عنوانات کے تحت تھے: i. موسیقی، بشمول ہندوستانی اور یورپی نیز ساز و آواز والی موسیقی؛ ii۔ خبریں، بلیٹن کی شکل میں اور موضوعاتی گفتگو، iii۔ عمومی گفتگو، iv۔ دیہی پروگرام، v۔ ریڈیو ڈرامہ[۲۵]۔ جب کہ ان پروگراموں کا نوے فیصد حصہ تفریحی موسیقی کے لیے وقف تھا، تو سوال یہ ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کا ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کی دہائیوں میں زبان کی بحثوں سے کیا تعلق بنتا ہے؟ اس کے بجائے للی ویلڈ (Lelyveld) اور وائیڈ مین (Weidman) کی مانند ہمارے تجزیے کا رخ تو موسیقی کے پروگراموں کی سیاست ہونا چاہیے تھا کہ کس طرح ان پروگراموں کی روشنی میں ہندوستانی ثقافتی ورثے کی معیار بندی اور تدوین کی جا رہی تھی۔ تاہم انیسویں صدی کے وسط سے لے کر بیسویں صدی کے آغاز تک زبان کے مباحث سیاسی اہمیت کے حامل تمام موضوعات میں شامل ہو گئے۔ ہندی سے متعلق مباحث کے مختلف اظہارات، دیگر زبانوں جیسے اردو، سنسکرت اور انگریزی سے اس کے تعلق اور ایک ادبی اور بول چال کی زبان کے طور پر اس کی موزونیت، آل انڈیا ریڈیو اسٹیشنوں کے پیشِ نظر تھی۔

اپریل ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ میں نشریاتی اسٹوڈیو کھلنے کے بعد ریڈیو پر ہونے والے مباحث نے بھارگو[۲۶] کی توجہ حاصل کی۔ بھارگو نے ریڈیو کی، نہ صرف خواندہ بلکہ دیہی آبادی کے سامعین کے لیے بھی، ہندی زبان و ادب اور ثقافت کی ترسیل کے ذریعے کے طور پر شناخت کی۔ اس ضمن میں انھوں نے نشریات کے ڈائریکٹروں کی جانب سے ہندی کو مسترد کرنے کو ایک مسئلے کے طور پر اٹھایا۔ انھوں نے متنبہ کیا کہ ریڈیو پر استعمال کردہ زبان دیہی آبادی کے لیے ناقابلِ فہم ہے، حتیٰ کہ پڑھے لکھے سامعین کے لیے بھی اس کا سمجھنا ایک چیلنج سے کم نہیں۔ ان کے اعداد و شمار کے مطابق صوبہ ہائے متحدہ کی آبادی کا ۹۰ فیصد حصہ ہندی اچھی طرح سمجھتا ہے جب کہ وہ ریڈیو کی زبان سمجھنے سے قاصر ہے۔ آج کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ان اعداد و شمار میں فی نفسہٖ خامی ہے۔ مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق ہندی بولیوں کے تنوع کی زمرہ بندی کی گئی تھی۔ ماہرِ لسانیات اور سول سرونٹ جارج گریرسن کی قیادت میں کیے جانے والے لسانی سروے میں مشرقی اور مغربی ہندی کے ۲۳ ذیلی زمروں (subcategories) کی ایک واحد زمرے کے طور پر علیٰحدہ شناخت کی گئی[۲۷]۔ بھارگو اور ہندی کے دیگر حامیان کے لیے ایک مسئلہ یہ تھا کہ نشریاتی اسٹیشنوں کی جانب سے استعمال کی جانے والی فرض کردہ "ہندوستانی" ان لوگوں کی لنگوا فرینکا نہیں تھی بلکہ کھڑی بولی اردو تھی جو کہ عربی اور

فارسی آمیز اردو تھی، جسے غلط طور پر ''ہندوستانی'' کا نام دیا گیا تھا۔ ہندی اور ''ہندوستانی'' کے درمیان بھی تنازعہ نہیں تھا، جس پر ہندی ساہتیہ سمیلن جیسے بڑے ہندی ادبی ادارے کے اجتماعات میں تواتر سے بحث ہوتی تھی اور یہ وہی دور ہے جس کا اس مقالے سے سروکار ہے[۲۸]۔ اس حاوی ادبی ڈسکورس میں ''ہندوستانی'' ہندی میں ضم ہو گئی[۲۹]۔

لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے ملازم اسٹیشن ڈائریکٹروں کی اکثریت درحقیقت مقامی اردو بولنے والوں کی تھی، جو کہ اکثر ہندی رسم الخط سے نابلد تھے۔ کیشو رام ساگر (ہندی ادبی سوسائٹی، ہندی ساہتیہ سبھا کے صدر) نے دہلی میں اپنی ایک تقریر میں تنبیہ کی تھی، جس سے ریڈیو کے شعبے میں فرقہ واریت کی فضا کا پتا چلتا ہے: ''جو کچھ بھی بطور ہندی نشر کیا جاتا ہے اسے اردو کے ذریعے چمکایا جاتا ہے[۳۰]۔'' رام ساگر نے ہندی سکرپٹ کی تدوین پر عدم اطمینان کا اظہار کیا تھا[۳۱] بھارگو نے مطالبہ کیا کہ ملازمین کی ناگری رسم الخط کی علمی کمی کو پورا کرنے کے لیے ریڈیو پروگراموں کے لیے ہندی ادیبوں کی خدمات لی جائیں، جن کی لکھنؤ میں کوئی کمی نہ تھی[۳۲]۔ بھارگو نے دعویٰ کیا کہ: ''برج نارائن، ملا میرا بائی پر بات کرتے ہیں اور ہرگوبند دیال، تلسی داس پر، جب کہ دونوں ہندی نہیں جانتے۔'' اس نے مطالبہ کیا کہ صوبہ ہائے متحدہ میں ہندی بولنے والوں اور مطبوعات کی تعداد کے مطابق ہندی کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ اس کے ساتھ انھوں نے ہندی زبان کے دو درجن سے زائد خواتین اور مرد حضرات کی فہرست بھی پیش کی[۳۳]۔ ناگری رسم الخط کے بارے میں بھارگو کی بات میں بہر حال وزن تھا۔ ریکارڈنگ ٹیکنالوجی کے فقدان اور سینسر شپ کے قواعد کی بدولت ہر پروگرام کو نشر کرنے سے قبل سکرپٹ کا تحریری صورت میں موجود ہونا لازم تھا۔ فارسی رسم الخط میں لکھے جانے والے سکرپٹ کو اکثر ہندی صوتیات آڑھا ترچھا کر دیتی تھی، جیسا کہ ہندی نیم واول 'r'(ر) بہ طور حرف عطف(Conjunct) کے پہلے اور دوسرے رکن کے تلفظ سے متعلق معاملہ ہے[۳۴]۔ بھارگو کے مشاہدے کے مطابق ریڈیو پر Rajendraprasad, Rajindaraaparsaad اور Rashtrapati کا تلفظ Rashtarpati کر دیا جاتا ہے[۳۵]۔ ہماری زبان (ہندی) نہ صرف برتی نہیں جاتی بلکہ اس سے ناانصافی کی جاتی ہے۔ مزید براں بھارگو نے ثقافتی ناخواندگی کی مختلف شکلوں کو بھی ہدفِ تنقید بنایا، جو اس طرح کے اظہار میں جگہ پاتے ہیں جیسے ''بیگم سیتا'' (ایسے لگتا ہے جیسے سیتا جی مغل دور کی کوئی ملکہ تھیں) یا ہندو تہواروں کے پروگراموں کے لیے اسلامی خیر مقدمی الفاظ ''آداب عرض'' کا استعمال کرنا۔ دلیل کے لحاظ سے زبانوں کی تعریف انفرادی لفظ کے اشتقاق کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ ہندی فاضلین نے بہت سی تجاویز پیش کیں کہ ریڈیو کے لیے دیسی زبان کس طرح تیار کی جائے، جو ان کے دعوے کے مطابق، پوری ہندوستانی آبادی کے لیے بہتر ثابت ہو گی۔ آخر کار ان کی تجاویز نے ہندی اور اردو میں پہلے سے موجود دراڑ کو مزید بڑا کرنے میں کردار ادا کیا، کیوں کہ زبانوں کے اشتقاق پر اصرار کا ناگزیر نتیجہ، ثقافتی اور مذہبی شناختوں کی تفریق تھا۔

سُدھا نے باقاعدگی سے آل انڈیا ریڈیو کے لکھنؤ، دہلی اور بمبئی اسٹیشنوں سے نشر کیے جانے والے پروگراموں،

بہ شمول ادبی تبصروں ڈراموں، شاعری اور گیتوں کی رپورٹنگ کی۔ ان سکرپٹوں کی طباعت سے زبانی نشریات کو ایک حیاتِ نو ملتی۔ سکرپٹ کے ساتھ خاکے اور تصاویر بھی شامل ہو جاتیں[۳۶]۔ اس نے باقاعدگی سے مضامین اور اداریے بھی شائع کیے۔ ان تحریروں کو زبان کی ان تند و تیز بحثوں اور تنازعات کے طور پر پڑھا جانا چاہیے جو انیسویں صدی کے وسط کے نصف دوم میں صوبہ ہائے متحدہ میں پیدا ہوئے[۳۷] اور جنھیں ۱۹۳۰ء کے عشرے میں از سر نو اہمیت ملی[۳۸]۔ یہ مباحث جدید ہندی کی بطور عوامی زبان تخلیق اور اردو سے جدا ''ادبی زبان'' ہونے کے گرد گھومتے ہیں۔ ہندی کا لسانی خاندان، اس کے ضابطے اور بطور دفتری (راج بھاشا) اور قومی (راشٹر ا بھاشا) زبان کے موضوعات بھی اس کا حصہ ہیں۔ ان مباحث میں ہندی-اردو زبان اور رسم الخط کے تنازعات، ہندوستانی کو بہ طور پورے ہندوستان کی زبان بنانے سے متعلق تجربات، ہندی زبان کی تدوین اور معیار بندی کی کوششیں اور ایک ایسی قومی زبان کی ضرورت جو نہ صرف پڑھی لکھی شہری آبادی کے لیے ہو بلکہ دیہی آبادی کے لیے بھی ہو، جیسے موضوعات شامل ہیں۔

رسائل نے علمی اور سیاسی بحثوں کی تشہیر اور پھیلاؤ میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ان میں وہ ادبی رسائل تھے جنھیں انیسویں صدی کے دوسرے حصے میں بھارتیو ندہریسشکاندرا اور بیسویں صدی کے اوائل میں مہاویر پرساد دیویدی نکالتے تھے۔ وہ رسائل جو زبان و ادب کے دائرے میں وسعت پیدا کر رہے تھے ان میں سُدھا، مادھوری اور قند شامل ہیں[۳۹]۔ خواتین، بچوں اور کسانوں کے رسائل کے علاوہ سیاسی ماہنامے بھی تھے[۴۰]۔ آل انڈیا ریڈیو بھی اپنے چار اسٹیشنوں سے رسائل شائع کر رہا تھا۔ ۱۹۳۶ء سے لے کر آگے تقریباً دو برس تک آواز دو رسم الخط، ہندی ناگری اور اردو نستعلیق، میں شائع ہوتا رہا، تاہم ۱۹۳۸ء میں یہ الگ الگ رسم الخط میں پندرہ روزہ کی صورت میں چھپنے لگے۔ سارنگ میں کھڑی بولی ہندی میں نشر ہونے والے پروگرام ہندی ناگری میں چھپتے اور آواز میں کھڑی بولی اردو والے پروگرام اردو نستعلیق میں چھپتے[۴۱]۔ جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا کہ فیلڈن ان مسائل سے مکمل طور پر آگاہ تھا جو ''ہندوستانی'' نامی زبان کو اس کے بولنے والوں سے جدا کرنے پر درپیش آنے تھے۔ دریں اثنا، دو جدا زبانوں اور جدا رسم الخط کو تسلیم کیے جانے کی تحریک کو مزید بڑھاوا ملا۔

**لسانی معاملات**

سُدھا میں شائع ہونے والی ریڈیو نشریات سنسکرت، عربی اور فارسی ذخیرہ الفاظ سے گریز کرتی اور ہندی اور اردو دونوں کے الفاظ استعمال کرتی اور کبھی کبھار انگریزی بھی برتتی[۴۲]۔ اسی سے ملتی جلتی چیز کا مطالبہ بھارگو جیسے حامیان نشریاتی زبان کے ضمن میں ایک وسیع تر اور لچک دار رجسٹر کے لیے کر رہے تھے۔ ریڈیو سکرپٹوں کی اشاعت سے اس بڑھتے ہوئے تصور کی توثیق ہوئی کہ 'ہندوستانی'، نہ کہ کھڑی بولی اردو یا کھڑی بولی ہندی کے اعلیٰ ادبی اظہار، عوامی زبان ہے۔

عمومی گفتگو کی دوبارہ طباعت کا ہدف ابھی تک بنیادی طور پر پڑھے لکھے سامعین ہی تھے[۴۳]۔ بھارگو اور دیگر ہندی

سیوک (جنھوں نے اپنے آپ کو ہندی کے لیے وقف کر رکھا تھا) دیہات کی ان پڑھ آبادی کے لیے بھی فکر مند تھے جنھیں سادہ زبان درکار تھی۔ جولائی ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ اسٹیشن نے دیہی آبادی کے لیے خصوصی پروگرام شروع کیے اور بھارگو[۴۴] نے دیہی پروگراموں پر بہت شائستہ بات کی: ”مستقبل قریب میں بڑے پیمانے پر پھیلے گی۔ اس طرح دیہی سامعین اپنے گھروں سے اسے روزانہ سن پائیں گے[۴۵]۔“ بد قسمتی سے یہ دیہی نشریات سُدھا میں شائع نہیں ہوئیں۔

آل انڈیا ریڈیو کی خبروں کے بارے میں تنازعہ پیدا ہوا۔ نیوز سروس ڈویژن، دہلی میں واقع تھا، جہاں سے خبروں کے انگریزی سکرپٹ مقامی نشریاتی اسٹیشنوں میں تقسیم کیے جاتے تھے۔ ہندوستانی میں ترجمہ کرنا ایک چیلنج تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ زبان کی لغت کیا ہو اور ہندی ناگری اور اردو نستعلیق رسم الخطوط کی موجودگی میں اسے کس طرح نقل (ٹرانسکرائب) کیا جائے؟

خبروں کی زبان کے حوالے سے سوالات پر ممبئی، کلکتہ، ڈھاکہ، دہلی، لاہور، لکھنؤ، مدراس، پشاور اور ٹرچیچی (Trichinopoly) کے اسٹیشن ڈائریکٹروں کی معمول کے اجلاسوں میں بحث کی جاتی تھی[۴۶]۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں فیصلہ کیا گیا کہ ہر مقامی اسٹیشن اپنی مقامی زبان میں نشریات کر سکتا ہے۔ یوں نہ صرف انگریزی، ہندوستانی اور بنگالی میں خبروں کے بلیٹن نشر ہوئے بلکہ تامل، تلگو، گجراتی، مراٹھی، پشتو اور فارسی میں ترجمہ بھی ہوئے[۴۷]۔ یہ ایک خوش گوار حل تھا مگر اس سے نبٹنے کے لیے بہت زیادہ حساسیت درکار تھی۔ بھارگو نے فوراً لکھنؤ اسٹیشن کے لیے عملی رکاوٹوں کی طرف اشارہ کیا، کیوں کہ صوبہ ہائے متحدہ ہندی بولنے والوں کے وطن کا مرکز تھا اور دوسری جانب دہلی سے موصول شدہ خبریں لکھنؤ میں مطلوبہ زبان میں نشر نہیں کی جاتیں:

> ہندوستانی کے نام پر دہلی اور لکھنؤ سے ٹھیٹھ اردو نشر کی جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہم ان کے خلاف ہیں۔ نشریاتی اسٹیشنوں کے سوامیوں کو بلاشبہ اردو برتنی چاہیے۔ تاہم انھیں اپنے کوڈ نہیں بھلانے چاہئیں۔ صوبہ ہائے متحدہ، ہندی کا گڑھ ہیں۔ ہندی بولنے والوں کی تعداد بے شمار ہے۔ اسی وجہ سے ان کی زبان استعمال کرنی چاہیے۔ ایسا اسی صورت میں ممکن ہے جب ریڈیو کا شعبہ ان ماہرین تک پہنچے جو ہندی جانتے ہوں[۴۸]۔

آیا خبروں کی نشریات میں اردو اور ہندی الفاظ کا شمار ہمیں بھارگو کے نتائج تک لے جائے گا؟ یہ اس مقالے کا سروکار نہیں تاہم بھارگو جس کشمکش سے گزر رہے تھے وہ واضح ہے۔ وہ اپنے آپ کو دو دھڑوں میں شامل کر رہے تھے۔ بھارگو کی اپنی نشریاتی زبان ”ہندوستانی“ تھی۔ ایک مؤثر ہندی ادبی رسالے کے مدیر اور ہندی کے ترجمان کے طور پر انھوں نے اعلیٰ رجسٹر والی ادبی ہندی کی بہت سی تحریریں بھی شائع کیں۔ ہندی زبان اور رسم الخط کی شناخت کے لیے اپنی جدوجہد کے باوجود بھارگو پوری طرح آگاہ تھے کہ ریڈیو کے لیے ایسی پالیسی کا دفاع کرنے کا نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ اپنے اعلیٰ رجسٹروں میں ہندی اور اردو دونوں ہی کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اسی لیے بھارگو نے دلیل دی:

> اگر ریڈیو کی زبان کی اصلاح نہیں کی جاتی تو ریڈیو کی مقبولیت کم ہو جائے گی۔ سامعین کوئی ادبی زبان سیکھنا نہیں

> چاہتے بلکہ ایسی زبان میں تفریح حاصل کرنا چاہتے ہیں جو آسانی سے سمجھ میں آتی ہو۔ دماغ کو ایسی مشقت میں نہیں ڈالا جاسکتا اور نہ ہی ریڈیو کے سامعین کو لغت دیکھنے کی ضرورت ہونی چاہیے۔

آل انڈیا ریڈیو کے لیے ہندوستانی کی لغت تیار کرنے کا منصوبہ جاری تھا کہ اکتوبر ۱۹۴۰ء کے سُدھا کے اداریے میں اپنی طویل رائے میں بھار گو نے واضح کہا کہ وہ نشریات کے منصوبے کو پورے ہندوستان کے لیے کس طرح تصور کرتے ہیں:

> ہندوستان میں عوام کی اکثریت ناخواندہ ہے یا نیم خواندہ۔ ریڈیو سب کے لیے ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسے نشریات ایسی زبان میں کرنی چاہیے جو لوگوں کی اکثریت کے لیے بآسانی قابلِ فہم ہو۔ ایک زندہ زبان توقعات پر اسی وقت پورا اتر سکتی ہے جب اسے عوام کی اکثریت سمجھتی ہو اور اس میں اپنے اعلیٰ ترین احساسات کا اظہار کر سکتی ہو[۴۹]۔

بھار گو، جو کہ ''ہندوستانی'' کے اردو سے اختلاط پر افسوس کر رہے تھے، ''ہندوستانی'' کے عوام کی زبان ہونے کے تصور کے مخالف نہیں تھے۔ وہ ایک بول چال کی زبان (ہندوستانی) اور دو منفرد ادبی زبانوں یعنی کھڑی بولی ہندی اور کھڑی بولی اردو میں تفریق کرتے تھے[۵۰]۔ جو زبان بھار گو اپنے ادارے میں استعمال کرتے تھے، اس میں وہ ہندی اور اردو الفاظ برتنے سے نہیں ہچکچاتے تھے: بھاشا اور زبان (language)، ادھک سے ادھک اور زیادہ سے زیادہ (most)، شبد اور لفظ (word)، پر اشنا اور سوال (question)، سُنکنا اور خبر (news)، یہ عام الفاظ ان کے اداریے میں آئے۔ بعض اوقات انھوں نے انگریزی الفاظ جیسے literature اور talk بھی استعمال کیے۔ انھوں نے اپنے اداریے کا اختتام برج بھاشا کے ایک شعر پر کیا، یعنی انھوں نے اپنے آپ کو برج بھاشا کے ہندی شاعری کی ابتدائی ادبی زبان کی حیثیت دلانے والے حامی کے طور پر بھی پیش کیا[۵۱]۔ بھار گو نے ادبی اور بول چال کی زبان کے مابین تعلق اور ''ہندوستانی'' لغت اور قواعد کے بارے میں اظہارِ خیال کیا:

> میرے خیال میں ''ہندوستانی'' ایک رلی ملی زبان ہے جو سنسکرت، پراکرت، برج بھاشا کھڑی بولی، فارسی، عربی، انگریزی فرانسیسی، پرتگیزی وغیرہ سے تشکیل پائی۔ جس طرح کھڑی بولی اردو کی شکل میں مسلمانوں کے تقاضے پوری کرتی ہے، اسی طرح ''ہندوستانی'' برطانوی حکومت اور تعلیم کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ برطانوی افسران نے 'ہندوستانی' کو اس کا نام دیا۔ انھوں نے اسے وہ زبان قرار دیا جس کے ذریعے وہ یہاں کے لوگوں سے بات چیت کر سکیں۔ اور اب یہ ''انگلستانی'' میں بدل رہی ہے، کیوں کہ انگریزی کے زیادہ سے زیادہ الفاظ اس میں شامل ہو رہے ہیں۔[...] ''ہندوستانی'' کو کھڑی بولی کے قواعد زبان اپنانے چاہئیں، آخر کار ''ہندوستانی'' کھڑی بولی ہی سے تو نکلی ہے اور برج بھاشا، بنگالی، گجراتی اور مراٹھی کے قواعدِ زبان کی بنیاد کھڑی بولی کے قواعد پر ہے۔ یہ زبانیں بولنے والے اسے بآسانی اختیار کریں گے۔ اگر ہم 'ہندوستانی' کو قومی زبان میں بدلنا چاہتے ہیں تو قومی تناظر میں یہ لازم ہو گا کہ ایک سادہ قواعدِ زبان اختیار کیے جائیں جو بنگال، گجرات، مہاراشٹرا، مدراس، پنجاب،

نیپال، بہار، مرکزی صوبوں، راجستھان وغیرہ میں بسنے والوں کے لیے اجنبی نہیں ہوں گے۔ جہاں تک لغت کا تعلق ہے تو "ہندوستانی" میں پہلے ہی دیگر زبانوں سے الفاظ داخل ہو چکے ہیں۔ میری رائے میں بنگالی، گجراتی اور مراٹھی کے الفاظ اس میں شامل کیے جانے چاہئیں تاکہ ہم 'ہندوستانی' کو ایک قومی زبان میں بدل سکیں۔ یوں ہم ایک ایسی زبان پیدا کرنے کے قابل ہو جائیں گے جو پورے بھارت دیش میں بولی اور سمجھی جائے گی[۵۲]۔

اس نقطے تک بھارگو کی رائے ہندی کے اعتدال پسند حامیان (سیاستدان اور فاضلین) کے مطابق تھی، جن کا اردو کے بارے میں مفاہمانہ رویہ تھا۔ ایک اور نقطۂ نظر بھی تھا جس کی قیادت ان کا ہم عصر مدیر، مہاویر پراساد دیویدی(۱۸۶۴ء-۱۹۳۸ء)، کر رہا تھا۔ مہاویر نے بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں بڑے منظم انداز میں، مگر ضروری نہیں کہ کامیابی کے ساتھ، ہندی زبان کی سنسکرت آمیز کھڑی بولی ہندی کے طور پر معیار ہندی کرنا اور اپنے رسالے سے فارسی، عربی اور انگریزی الفاظ حذف کرنے چاہے[۵۳]۔ بھارگو کی خواہش تھی کہ ہندی اور اردو کیمپ ایک دوسرے کے قریب آئیں اور قومی دھارے کی طرف بڑھیں۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ سنسکرت، عربی اور فارسی آمیز مستعار الفاظ سے گریز کرنا چاہیے، جب تک کہ وہ کم از کم ایک سے زائد مقامی زبانوں میں عام مستعمل نہ ہوں۔ بھارگو اس اصول پر اخبار ہل (Plough) میں اپنی تحریروں میں عمل پیرا ہوئے۔ یہ اخبار اصلاحِ دیہہ کے افسر کی جانب سے جاری کیا گیا تھا۔ ان کی اپنی تحریر بھی اس چیز کی بہترین مثال ہے کہ عوام کی بول چال کی زبان کا اظہار تحریری صورت میں بھی ممکن ہے۔ تاہم ان کی اس تجویز نے کہ اصطلاح "ہندوستانی" سے جان چھڑائی جائے اور اس کی جگہ اصطلاح "بھارتی" لائی جائے، جو کہ علم سیکھنے کی دیوی سرسوتی کا بھی نام تھا، اس بحث کو ہندی-ہندو کیمپ میں دوبارہ داخل کر دیا: "ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں، پارسیوں، سکھوں، جینیوں، بدھوں تمام ہندوستانی آبادی کو اس دیوی "بھارتی" کو تکریم اور منزلت دینی چاہیے[۵۴]۔" بھارگو کی دلیل تھی کہ اس طرح کی چیز بحث کو ہندی- اردو تنازع سے کاٹ ڈالے گی۔ اس کی بجائے یہ اسے اس قومی سطح پر لے آئے گی جس پر ہندوستان بھارت (ورش) بن گیا۔ آخر الذکر اصطلاح سنسکرت سے اخذ شدہ ہے۔ یہ چیز اس محاورے کے عین مطابق ہے جو کانگرسی سیاستدانوں جیسے سمپورن آنند(۱۸۹۱ء-۱۹۶۹ء) اور پرشوتم داس ٹنڈن(۱۸۸۲ء-۱۹۶۲ء) اور زبان کی صحت پر زیادہ اصرار کرنے والوں نے استعمال کیا۔ انھوں نے شدید روایتی سنسکرت آمیز ہندی میں، جو عربی اور فارسی کے ذخیرہ الفاظ سے پاک ہو، "زبان سب کے لیے" کی آواز بلند کی[۵۵]۔ بالآخر بھارگو مقبول ہندی نعروں کی لپیٹ میں آ گئے جو اس وقت کی ادبی اور سیاسی بحثوں میں عام پایا جاتا تھا۔ اس طرح انھوں نے اپنے آپ کو اپنی پیدا کردہ اصطلاح کے جال میں پھنسا لیا تاہم ان کا ہندی اور اردو کی آمیزش "ہندوستانی"/ "بھارتی" کو آشکار کرنے کے قابل تھا۔

## بنیادی ہندی کی جانب؟ آل انڈیا ریڈیو صوتی حروفِ تہجی اور الفاظ

یہ حصہ خاص طور پر ریڈیو کی لغت کی تیاری سے متعلق ہے۔ برطانوی اور ہندوستانی ماہرینِ لسانیات اور ادیب مشترکہ طور پر ایک قابل قبول زبان کی تیاری اور اس کے ساتھ ساتھ ریڈیو کے لیے رسم الخط بنانے کے لیے کوشاں تھے۔ ان مباحث سے دو کلیدی کردار احمد شاہ بخاری (۱۹۵۸ء-۱۸۹۸ء) اور ان کے ہم کار جان فرتھ (John Rupert Firth۔ ۱۸۹۰ء-۱۹۶۰ء) تھے۔ بخاری انڈین اسٹیٹ سروسز کے دہلی اسٹیشن کے ڈائریکٹر تھے اور وہ ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو میں ڈائریکٹر جنرل کے طور پر لیونل فیلڈن کے جان نشین ہوئے[۵۶]۔ برطانوی ماہرِ لسانیات وصوتیات فرتھ نے ہندوستان اور برطانیہ میں ہندوستانی زبانوں کے علم صوتیات پر تحقیق کر کے ڈگری حاصل کی تھی۔ اس نے برطانوی حروفِ تہجی اور عالمی صوتی حروف (IPA) کی عملی خامیوں کی نشاندہی کی اور ٹی۔ بی میکالے (Thomas Babington Macaulay۔ ۱۸۰۰ء-۱۸۵۹ء) کے تعلیم پر پیش کی گئی مؤثر روداد پر بڑی سخت رائے دیتے ہوئے کہا: ''ہم انگریزوں نے لارڈ میکالے کی رائے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنی اے بی سی اور اپنا ادبی خزانہ اپنی ہندوستانی ساتھی رعایا پر مسلط کر دیا[۵۷]۔'' جوابی طور پر اس نے آل انڈیا ریڈیو کے لیے بڑے خلوص سے حروفِ تہجی تیار کیے جو ہندوستانی زبانوں کی پیچیدگیوں کو حل کرتے تھے اور رومن حروف کے ذریعے ہندوستانی زبانوں کی صوتیات کے تنوع کی معیار بندی کرتے تھے۔ جیسا کہ ان کے ہم عصر ڈینیل جونز، جس نے فرتھ کے حروف کا سنہالی پر اطلاق کیا تھا، نے نوٹ کیا کہ رومن آمیز آل انڈیا حروف نے نہایت احسن طریقے سے صوتیات، نفسیات ٹائپو گرافی اور کیلی گرافی کے تمام تقاضے پورے کیے[۵۸]۔

تاہم نقلِ حرفی کے لیے مناسب حرف کے ساتھ اور ہندی آوازوں کا تلفظ ادا ہونے کے بعد بھی یہ تنازعہ ختم نہ ہو پایا۔ جس چیز سے ابھی تک نبٹنا باقی تھا وہ لغت تھی۔ اس تناظر میں ہندوستانی ریڈیو کی زبان کے لیے ''بنیادی انگریزی'' بہ طور ایک ماڈل کا تصور مناسب ثابت ہوا۔ یہ تصور آگڈن (Charles Kay Ogden۔ ۱۸۸۹ء-۱۹۵۷ء) کے زبان کے فلسفے پر مبنی ہے، جس نے ایک عالمی زبان اور تجارت کی زبان کا خواب دیکھا تھا، جس کی جڑیں انگریزی میں ہوں اور جو سادہ انگریزی گرامر کے اصولوں کے ساتھ ساتھ ۸۵۰ الفاظ سے زائد پر مبنی نہ ہو[۵۹]۔ سُدھا میں لکھنے والوں میں سے بہت سوں نے رائے دی کہ بنیادی ہندی کا اسی طرز کا ایک ماڈل ہندی-اردو کشمکش اور ہندو مسلم ٹکراؤ میں کمی لا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ستیہ پرکاش (پ: ۱۹۰۵ء)، (الٰہ آباد یونیورسٹی میں کیمسٹ تھے۔ اس کے علاوہ شاعر تھے اور سُدھا میں تواتر سے لکھتے تھے) نے سُدھا میں اپنے ایک مضمون میں ریڈیو کی زبان کے متعلق 'بنیادی ہندی' کی افادیت کے سوال پر بحث کی[۶۰]۔ دنیا کی زبانوں کے بولنے والوں کا ایک سادہ ساعددی موازنہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ چینی زبان (تقریبا ۴۵۰ ملین) اور ہندی زبان (تقریبا ۲۰۰ ملین) کے بعد انگریزی بولنے والوں کا درجہ تیسرے نمبر پر آتا ہے۔ دوسری طرف انگریزی برطانوی ہندوستان کی سرکاری زبان تھی، بشمول ۳۵۰ ملین لوگ نیز یہ پوری دنیا میں ۶۵۰ ملین لوگوں کی تجارت کی بین الاقوامی زبان بھی

تھی[۶۱]۔ مگر ہندوستان میں ۱۰ ملین سے کم لوگ انگریزی سے واقفیت رکھتے تھے۔ بنیادی ہندی کی ترویج کے ضمن میں ستیہ پرکاش نے ۷۰۰ سے ۸۰۰ الفاظ پر مشتمل ایک ہندی لغت کی تیاری کی وکالت کی[۶۲]۔ آل انڈیا ریڈیو کی خبروں، بلیٹن اور بات چیت کی زبان اسی طرح کی لغت پر مبنی ہونا تھی۔

بھارگو نے بنیادی زبان کے تصور کو بڑھاوا دیا، اگرچہ پہلے پہل انھوں نے اسے بنیادی ''ہندوستانی'' کہا: ''اگر ہمارے پاس بنیادی انگریزی[۶۳] کی طرز پر بنیادی ''ہندوستانی'' ہوتی تو ریڈیو پر زبان کا مسئلہ حل ہو جاتا۔ ایک سادہ زبان، جسے بآسانی سیکھا جا سکتا ہو، اور جو پورے ہندوستان کے لیے کافی ہو۔'' بھارگو خود بھی اس بات سے آگاہ تھے کہ لسانی تناظر میں یہ کوئی آسان منصوبہ نہیں تھا[۶۴]۔ جس ریڈیو لغت کا انھوں نے سوچا تھا وہ ۴۰۰۰ الفاظ پر مبنی تھی اور جسے ریڈیو کی خبروں اور گفتگو میں پھیلایا جانا تھا۔ لغت کو پورے ملک کو ذہن میں رکھتے ہوئے تیار کیا جانا تھا۔ انھوں نے بنیادی انگریزی کی طرز پر مترادفات ختم کر کے الفاظ کے ذخیرے کو کم کرنا تجویز کیا تھا۔ ''ہندوستانی'' کے معاملے میں اس کا مطلب تھا کہ ہندی، اردو اور دیگر علاقائی زبانوں کو عربی، فارسی اور سنسکرت کے الفاظ کے برابر اہمیت دینا۔ بھارگو نے تجویز دی:

> اس وقت ہمارے پاس ''پریذیڈنٹ''، ''سبھاپتی'' اور ''صدر'' کے الفاظ ہیں اور یہ تینوں ہی مستعمل ہیں۔ بعد میں ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا چاہئے۔ ''water'' کے لیے ''پانی''، ''جل'' اور ''آب'' تینوں ہی قابل قبول ہیں، مگر بنگالی اور مہاراشٹر امیں صرف ''جل'' ہی استعمال میں ہے، لہٰذا مستقبل میں ہمیں صرف ''جل'' پر ہی کاربند رہنا چاہیے۔ ''ہندوستانی'' اور مراٹھی میں ''تعلیم'' مستعمل ہے، مگر مراٹھی میں ''تعلیم'' کے ساتھ تھوڑے بہت مختلف مرکب الفاظ بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ مستقبل میں انھیں لغت سے خارج کرنا ہوگا یا لفظ ''تعلیم'' کو مکمل طور پر ہٹانا ہوگا[۶۵]۔

یہ کیوں کر ممکن تھا کہ ایک بالغ فرد کے ذخیرہ الفاظ کو، جو ستیہ پرکاش کے مطابق، بیس ہزار الفاظ تک مشتمل ہو سکتا ہے، کم کر کے ۸۰۰–۹۰۰ الفاظ تک لایا جائے؟ یہاں اپنے ۸۵۰ الفاظ کے ساتھ بنیادی انگریزی بہ طور نمونہ کام دے گی، جیسا کہ ستیہ پرکاش نے ایک خاکہ پیش کیا کہ بنیادی انگریزی ۱۸ افعال (verbs) پر مبنی ہے اور تقریباً ۲۰ حروف ربط (prepositions) کی مدد سے اور اسم کے ساتھ مرکب افعال بنا کر بنیادی معنی تبدیل کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ ۶۰۰ اسم تھے، ۱۵۰ اسم صفت (adjectives) اور اسم ضمیر (pronoun) اور اسم صفت سے باقی ۶۲ الفاظ بنے۔ بنیادی ہندی اسی نمونے پر عمل پیرا ہو سکتی ہے[۶۶]۔ علاوہ ازیں انگریزی سے ۵۰ الفاظ اور کچھ الفاظ فارسی اور عربی سے شامل کیے جا سکتے ہیں، بہ شرط یہ کہ وہ ہندی، بنگالی، مراٹھی اور گجراتی میں عمومی طور پر مستعمل ہوں۔ جہاں تک اردو الفاظ کی شرح کا تعلق ہے تو ستیہ پرکاش نے ۶ سے ۷ فیصد اور انگریزی الفاظ کے لیے ۳ فیصد کی تجویز دی۔ جب کسی طالب علم کی لغت میں ہندی الفاظ (کا ذخیرہ) منظم انداز میں بڑھے گا تو اسی صورت میں یہ

ممکن ہو گا کہ اردو کے الفاظ کو مرحلہ وار تبدیل کیا جائے۔ ستیہ پرکاش نے یہ تسلیم کیا کہ جس ہندی کا ان کے ذہن میں خاکہ تھا وہ روزمرہ کی بازار کی زبان سے مختلف تھی۔ اس میں اردو کے الفاظ تھے: ''یقیناً، بازار میں ایک پڑھا لکھا شخص بھی قیمت پوچھتے ہوئے 'دام' اور 'چیز' نہ کہ 'ملایا' اور 'وستو' کے الفاظ برتے گا''[67]۔ (اس چیز کے دام کیا ہیں؟ نہ کہ اس وستو کا ملایا کیا ہے؟) ستیہ پرکاش کی ہندی کی مثالوں میں بدھی، وکترا، وستو، اور سوابھو شامل تھے، جنھوں نے اردو کی عقل، عجب، چیز اور عادت کی جگہ لینی تھی۔ آخر میں ایک ہزار الفاظ کی ایک فہرست کو تمام ہندوستانیوں کے لیے لازم قرار دیا جانا تھا اور جس کی ترویج ریڈیو کے ذریعے ہونی تھی۔

آل انڈیا ریڈیو ان مباحث سے لاتعلق نہیں رہا۔ اس کے زیرِ سایہ معروف ہندی لکھاری اور شاعر سچی دانند ہیرانند وتسائن اگیے (Sachchidananda Hirananda Vatsyayan۔ ۱۹۱۱ء-۱۹۸۷ء)، جو سُدھا میں بھی تواتر سے لکھتے تھے، اور چراغ حسن حسرت (۱۹۰۴ء-۱۹۵۵) ۱۹۴۰ء سے لغت تیار کر رہے تھے۔ ''ہندوستانی'' خبروں کی نشریات کے لیے مستند لغت کی تیاری کا طریقہ کار بڑا واضح تھا: آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے فراہم کردہ انگریزی متن کو بنیاد بنانا جس سے ہندی اور اردو سکرپٹ تیار کیے جانے تھے، ہر لکھاری انگریزی ذخیرۂ الفاظ سے ہندی یا اردو متبادل کی تلاش کر لیتا۔ پھر دونوں سب سے زیادہ عام، مختصر اور اگر ممکن ہو تو ''غیر جانب دار'' لفظ کی شناخت کرتے جو لغت میں شامل ہو جاتے[68]۔ یہ لغت، تقاریر اور خصوصی لیکچر / خطبات کے لیے لازم نہیں تھی۔ ایسے مقتدر / حاکمانہ کام پر عمل پیرا ہونے سے ستیہ پرکاش اور سُدھا کے دیگر لکھاریوں نے عدمِ توازن (اردو کے حق میں) کی نشان دہی کی۔ کیشورام ساگر نے، جیسا کہ بھارگو نے توضیح کی، اس طرح کی ہندوستانی لغت کی تیاری کو ناقص قرار دیا اور اس منصوبے پر عدم اطمینان کا اظہار کیا[69]۔

آنے والے برسوں میں لغت سے متعلق سوالات نے، ریڈیو کی زبان کے تعین کے لیے کیے گئے مباحث میں مرکزی حیثیت اختیار کی ہیں۔ ستیہ پرکاش، بھارگو اور اگیے، چراغ حسن حسرت کے ساتھ منصوبوں کا انحصار ایک ایسی بنیادی زبان (بھاشا) بنانے پر تھا جو ہندی، بھارتی اور ''ہندوستانی'' کے ناموں سے موجود تھی۔ کانگریس کے بہت سے سرکردہ سیاست دان، بشمول موہن داس گاندھی، عبدالحق اور جواہر لال نہرو اس طرح کے منصوبے کے حق میں تھے۔ دیگر نے 'ہندوستانی' کو ناقابلِ عمل بلکہ اس کے وجود ہی سے انکار کیا اور ہندی اور اردو کے اپنے منفرد رسم الخط کے ساتھ جداگانہ زبانوں اور ادب کی تیاری کا مطالبہ کیا۔ مشرا کے مطابق ''ہندوستانی'' کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ اسے بولنے والوں کی زبان کی تعریف کی روشنی میں ڈھالا جا سکتا تھا: گاندھی کی زبان میں یہ خالص ہندی لگتی تو مولانا آزاد کی زبان میں یہ خالص اردو۔ بھارگو کے برعکس مشرا نے جو زبان استعمال کی وہ سنسکرت آمیز ہندی تھی، جس کی بہت سے ادبی اور لسانی ادارے بطور قومی زبان ترویج کر رہے تھے۔ مشرا کے سنسکرت سے مستعار لیے گئے کچھ الفاظ اس قدر پیچیدہ یا مصنوعی تھے کہ ان کے ساتھ انگریزی ترجمہ دیا گیا[70]۔ ادبی مقتدرہ اور اداروں کے ترجمان، جیسے ہندی ساہتیہ

سمیلن نے سُدھا میں اپنی تحریروں میں بھاری بھرکم سنسکرت آمیز ہندی استعمال کی اور اردو الفاظ سے اعتنا برتتے ہوئے بحث میں اپنا حصہ ڈالا۔ پرشوتم داس ٹنڈن نے، مثال کے طور پر، خالص ہندی نہ کہ ہندوستانی کے پھیلاؤ کی حمایت کی۔ ان تمام آرا کی نمائندگی سُدھا میں کی جاتی تھی۔ رسالے کے مدیر بھارگو نے ایک ایسی قوم، جس نے جلد وجود میں آنا تھا، کے لیے قومی زبان اور لنگوا فرینکا کے لیے ایک وسیع اور جامع مؤقف کو فروغ دیا تھا اور یہ قوم آج تک ہندوستان کی سرکاری زبان یعنی ہندی کے قابلِ تفہیم اور قابلِ قرأت ہونے کے سوال سے نبرد آزما ہے۔

**اختتامیہ**

یہ مقالہ اس لسانی سیاست کا جائزہ لیتا ہے جس نے ۱۹۳۸ء اور ۱۹۴۰ء کے بیچ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ اسٹیشن سے نشر ہونے والے مباحث میں جگہ بنائی۔ نشر ہونے والی گفتگو، خبریں اور دیہی پروگرام تو نہیں زبان ضرور خطرے میں تھی۔ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹروں، دلاری لال بھارگو اور ان کے ساتھیوں، مدیروں، ناشروں اور ادیبوں نے پہلے لسانی سیاست کو اشاعت کی دنیا سے اٹھا کر ہوا کے دوش پر لے گئے اور پھر واپس رسائل میں لے آئے۔ جب آل انڈیا ریڈیو کی ہندوستانی لغت کا منصوبہ ۱۹۴۵ء میں مکمل ہوا، ہندوستانی کے تصور نے ہندی اور اردو کی علیٰحدہ ریڈیو نشریات کی راہ ہموار کی[۱۱]۔ آل انڈیا ریڈیو کی زبان لوگوں کو متحد کرنے والی نہ رہی۔ اب توجہ ایک مرکزی ادارے سے ہٹ کر مختلف اسٹیشنوں سے ان کی جدید معیاری مقامی زبانوں میں نشریات پر ہو گئی۔ بھارگو کا ریڈیو کی زبان اور عوام کی زبان کا کثیر سطحی تصور سیاسی میدان میں جگہ نہ بنا سکا تاہم یہ تصور ان کے ادبی رسالے سُدھا میں ضرور قائم رہا۔ سُدھا میں ہندی بیلٹ (پٹی) کے بہت سے علاقوں سے عام لوگوں، بہ شمول خواتین، کی نثر اور شاعری شائع ہوتی تھی۔ بھارگو کے لیے ہندوستانی کی حمایت کرنے کا مطلب دیہی سامعین کی حمایت کرنا بھی تھا، جو اگرچہ اس کے رسالے کے قارئین نہیں تھے مگر ان کا اسے خیال تو تھا۔

آزادی کے بعد آل انڈیا ریڈیو کی لغت کا نظرِ ثانی شدہ ۱۹۷۰ء والا ایڈیشن اصل میں ۸۵۰۰ الفاظ والی لغت ہے، جسے ۱۹۴۵ء میں اجنیا اور حسرت نے تیار کیا تھا۔ یہ لغت ایسے اندراجات کی حامل ہے جن کا زیادہ تر حصہ اگر انگریزی الفاظ کے لیے ہندی، اردو یا ہندوستانی کے متبادلات پر مشتمل نہیں تو ہندی-ناگری رسم الخط میں کم از کم دو متبادلات ضرور دیے گئے ہیں۔ آخر میں یہ کہ ممکن ہے کہ یہ لسانی اور ثقافتی لچک اور اشتقاقی تنوع ہو، جس کی ترویج بھارگو نے کی، جو بالآخر غالب رہی۔

## حواشی و حوالہ جات

* (پ:۱۹۷۴ء) ایسوسی ایٹ پروفیسر (ہندی زبان)، شعبۂ زبان و ادب اور لسانیات، یارک یونیورسٹی، ٹورنٹو، کینیڈا۔

** (پ:۱۹۷۲ء) اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

۱۔ ”ہندستانی“ از مہاتما گاندھی، مشمولہ: قومی زبان، زیڈ۔اے۔احمد (مرتب)، معین اعجاز (مترجم)، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان (نئی دہلی، ۲۰۰۱ء)، ۲۷۔

۲۔ شوبنا نجھاوان[Shobna Nijhwan]، *Women and Girls in the Hindi Public Sphere: Periodical Literature in Colonial North India* (دہلی: اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۲ء)۔

۳۔ یو۔ایل۔بروہا[U. L. Baruah]، *This is All India Radio: A Handbook of Radio Broadcasting in India* (دہلی: وزارتِ اطلاعات و نشریات، حکومتِ ہندوستان، ۱۹۸۳ء)، ۵۔

۴۔ الاسڈیر پنکارٹن[Alasdair Pinkerton]، ” Radio and the Raj: Broadcasting in British India (1920–1940)“، مشمولہ *Journal of the Royal Asiatic Society*، جلد ۲، شمارہ ۱۸ (اپریل، ۲۰۰۸ء)، ۱۶۷-۱۹۱۔

۵۔ برٹش لائبریری Endangered Archive Programme کے نام سے دنیا بھر سے مخطوطات، کتابیں اور رسائل کو ڈیجیٹائز کرنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ اسی پروگرام کے تحت سُدھا اور مادھوری جیسے رسائل کے دستیاب نسخوں کو محفوظ کیا گیا ہے، جو آن لائن دستیاب ہیں۔ دیکھیے: https://eap.bl.uk (۳۱ مئی ۲۰۲۲ء)۔

۶۔ ڈیوڈ لیلی ولڈ[David Lelyveld]، ”Colonial Knowledge and the Fate of Hindustani“، مشمولہ *Comparative Studies in Society and History*، جلد ۴، شمارہ ۳۵ (اکتوبر، ۱۹۹۳ء)، ۶۶۵-۶۸۲۔

۷۔ لیونل فیلڈن[Lionel Fielden]، *Report on the Progress of Broadcasting in India up to 1939* (شملہ: گورنمنٹ آف انڈیا پریس، ۱۹۴۰ء)، ۲۶۔

۸۔ ایضاً، ۲۶۔

۹۔ ڈیوڈ لیلی ولڈ[David Lelyveld]، ”Colonial Knowledge and the Fate of Hindustani“، ۶۶۵-۶۸۲۔

۱۰۔ وسودھا ڈالمیا[Vasudha Dalmia]، *The Nationalization of Hindu Traditions. Bharatendu Harishchandra and Nineteenth-century Banaras.* (دہلی: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۷ء)۔

۱۱۔ ان کے بارے میں کسی بھی نوعیت کی تاریخیں دستیاب نہیں۔ ان کی ہندوستانی-انگریزی لغت پر ۱۸۳۹ء درج ہے۔ (مترجم)

۱۲۔ وسودھا ڈالمیا[Vasudha Dalmia]، *The Nationalization of Hindu Traditions. Bharatendu Harishchandra and Nineteenth-century Banaras.* (دہلی: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۷ء)، ۱۶۱-۱۶۸۔

۱۳۔ ڈیوڈ لیلی ولڈ[David Lelyveld]، ”Colonial Knowledge and the Fate of Hindustani“، ۶۷۳-۶۷۵۔

۱۴۔ رمیشورناتھ مشرا[Rameshvarnath Mishra]، ”ہندی، اردو اور ہندوستانی یا راسٹر بھاشا کا پرشنا“، مشمولہ سُدھا، جلد ۴، شمارہ ۱۴ (نومبر ۱۹۴۰ء)، ۵۲۵-۵۲۸۔

۱۵۔ دلارے لال بھارگو[Dulare Lal Bhargava]، ”ریڈیو اور ہندی“، مشمولہ سُدھا، جلد ۶، شمارہ ۱۴ (جولائی، ۱۹۴۱ء)، ۵۹۲-۵۹۴۔

۱۶۔ دلارے لال بھارگو[Dulare Lal Bhargava]، ”ریڈیو براڈکاسٹنگ اور ہندی“، مشمولہ سُدھا، جلد ۱، شمارہ ۱۲ (اگست، ۱۹۳۸ء)، ۱۵۶-۱۵۷۔

۱۷۔ جدید ہند آریائی زبانوں میں سنسکرت سے مستعار الفاظ

۱۸۔ دلارے لال بھارگو[Dulare Lal Bhargava]، ''ریڈیو اسٹیشنوں سے کیسی بولی بولی جانی چاہیے''، مشمولہ سُدھا، جلد ۳، شمارہ ۱۴ (اکتوبر، ۱۹۴۰ء)، ۴۲۱۔ ۴۲۵۔

۱۹۔ ان مآخذ میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل وہ تفصیلی رپورٹ ہے جسے فیلڈن نے تیار کیا تھا۔

۲۰۔ بی بی سی (۱۹۲۷ میں انگلستان میں قائم شدہ) کے ساتھ برطانوی ہند میں اپنے قدم جمانے کی خواہش کے باوجود حکومت نے ابتداً دیے جانے والے ماہانہ اخراجات ۳۳،۰۰۰ سے کم کر کے ۲۲،۰۰۰ کر دیے، جو محض ممبئی اور کلکتہ کے دو اوسط درجے کے اسٹیشنوں کو چلانے کے لیے کافی تھے۔ فیلڈن نے اس پر یوں تبصرہ کیا:

''پس دنیا کی دیگر نشریاتی سروسز کے بالکل الٹ، جو کہ اپنے اخراجات میں اضافہ کر رہی تھیں اور یوں اپنے پروگراموں کے معیار میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہی تھیں، انڈین براڈکاسٹنگ سروس کو مجبور کیا جا رہا تھا کہ کم سے کم معیار اختیار کرے۔ نشریات کے پھیلاؤ کو جاننے کے لیے ایسی پالیسی کا اس سے بہتر تخمینہ نہیں لگایا جا سکتا، اگرچہ ایسی پالیسی کی عمومی معاشی زاویۂ نظر سے توجیہ کرنا ممکن ہے۔''

دیکھیے: لیونل فیلڈن، *Report on the Progress of Broadcasting in India up to 1939*، ۴۔

بی بی سی کی ''Empire Broadcasting'' کے عمومی جائزے کے لیے دیکھیں:

سائمن جے پوٹر[Simon J. Poter]، *Broadcasting Empire: The BBC and the British World, 1922–1970.*، (آکسفرڈ: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۲ء)۔

۲۱۔ سائمن جے پوٹر، *Broadcasting Empire: The BBC and the British World, 1922–1970.*۔

۲۲۔ فرانچسکا اورسینی[Francesca Orsini]، *The Hindi Public Sphere, 1920–1940: Language and Literature in the Age of Nationalism.*، (دہلی: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۲ء)، ۲۴۔

۲۳۔ زیڈ۔ اے۔ احمد، ''جواہر لال نہرو''، (مترجم) معین اعجاز، مشمولہ قومی زبان، (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۲۰۰۱ء)، ۵۴۔ بنیادی ہندوستانی: یہ تصور اس حد تک مقبول ہوا کہ نہرو نے بھی اسے سراہا: ''ہماری رہنمائی کے لیے قابلِ ذکر حد تک کامیاب ایک تجربہ 'بیسک انگلش' کا ہے۔ متعدد اسکالرز نے برسوں کی محنت کے بعد ایک آسان سی انگریزی وضع کی جو بنیادی طور پر انگریزی ہی ہے، اور اسے عام انگریزی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود اسے سیکھنا حیرت انگیز حد تک آسان ہے۔ چند آسان سے اصولوں کے سوا قواعد اس میں سرے سے غائب ہے اور الفاظ کے بنیادی ذخیرے کو کم کر کے ۹۸۰ الفاظ تک محدود رکھا گیا ہے۔ ان میں سائنسی، تکنیکی اور تجارتی اصطلاحات شامل نہیں ہیں۔ پورے ذخیرۂ الفاظ اور قواعد کو کاغذ کے ایک ہی ٹکڑے پر سمیٹا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی ذہین آدمی دو یا تین ہفتوں میں اسے سیکھ سکتا ہے۔

۲۴۔ الریک اسٹارک[Ulrike Stark]، *An Empire of Books: The Naval Kishore Press and the Diffusion of the Printed Word in Colonial India.*، (نئی دہلی: پرماننٹ بلیک، ۲۰۰۷ء)، ۴۳۷۔

۲۵۔ لیونل فیلڈن[Lionel Fielden]، *Report on the Progress of Broadcasting in India up to 1939*، ۱۹۔ فیلڈن ۱۹۳۸ کی بمبئی اسٹیشن کی نشریات کے لیے ذرا مختلف عنوانات کی فہرست دیتا ہے، جس میں تعلیمی، مذہبی اور خواتین کے پروگرام اور سکول کی نشریات شامل ہیں۔ ان کی رپورٹ 'کا ضمیمہ ii بہ تفصیل اپریل ۱۹۳۷ سے مارچ ۱۹۳۹ تک کے مستحکم ریڈیو اسٹیشنوں، جیسے دہلی، کلکتہ اور پشاور کے ریڈیو اسٹیشنوں اور چند نئے اضافہ کیے گئے جیسے مدراس، لاہور اور لکھنؤ کے اسٹیشنوں کے مختلف پروگراموں کے لیے مختص کیے گئے ماہانہ گھنٹوں کا تفصیلی خاکہ پیش کرتا ہے۔ تین برس کے عرصے میں یورپی ساز و آواز والی موسیقی نے اپنی اہمیت کھو دی اور لیکچروں / خطبات، گفتگو اور ریڈیو ڈرامہ اور شاعری کے لیے گھنٹوں کی تعداد میں اضافہ ہوا، خاص طور پر کلکتہ میں۔ دہلی، ممبئی اور کلکتہ اسٹیشنوں پر خبروں کے گھنٹوں میں اضافہ ہوا تو مدراس اور پشاور اسٹیشنوں پر دیہی پروگراموں میں۔ کمار [۲] اور دیگر اسکالرز کے مطابق آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام برٹش براڈکاسٹنگ کارپوریشن کے پروگراموں اور فلسفے پر مبنی ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد بھی آل انڈیا ریڈیو

کے پروگرام اسی وضع پر قائم رہے تاہم دلچسپی کے موضوعات جیسے کاشت کاری، نوجوانوں، قومی، اقلیتوں اور کھیل کے پروگراموں میں توسیع ہوئی [۳]۔ (مترجم)

۱۔ لیونل فیلڈن [Lionel Fielden]، *Report on the Progress of Broadcasting in India up to 1939*، ۱۷۶-۱۸۴۔

۲۔ کانچن کمار [Kanchan Kumar]، "Mixed Signals: Radio Broadcasting Policy in India"، مشمولہ *Economic and Political Weekly*، جلد ۲۲، شمارہ ۳۸ (مئی / جون ۲۰۰۳ء)، ۲۱۷۳-۲۱۸۲۔ دیکھیے: https://www.jstor.org/stable/4413630?seq=1 (۳ جون ۲۰۲۲ء)۔

۳۔ یو۔ ایل۔ بروہا [U. L. Baruah]، *This is All India Radio: A Handbook of Radio Broadcasting in India* (دہلی: وزارتِ اطلاعات و نشریات، حکومتِ ہندوستان، ۱۹۸۳ء)، vii۔

۲۶۔ دلارے لال بھارگو [Dulare Lal Bhargava]، "ریڈیو براڈکاسٹنگ اور ہندی"، ۱۵۶-۱۵۷۔

۲۷۔ مردم شماری کی سیاست اور زبان اور ووٹ کے مابین تعلق پر مفید خاکہ فراہم کرتا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: ڈیوڈ لیلی ولڈ [David Lelyveld]، "Colonial Knowledge and the Fate of Hindustani"، ۶۷۷۔

۲۸۔ فرانچیسکا اورسینی [Francesca Orsini]، *The Hindi Public Sphere, 1920–1940: Language and Literature in the Age of Nationalism.*، ۳۶۴-۳۶۲۔

۲۹۔ ایضاً، ۳۶۴۔

۳۰۔ دلارے لال بھارگو [Dulare Lal Bhargava]، "ریڈیو اور ہندی"، ۵۹۳۔

۳۱۔ ہندی سے انگریزی کے تمام تراجم اس مقالے کے مصنف نے کیے ہیں۔ مختصر اقتباسات میں استعمال ہونے والے اٹالک الفاظ انگریزی اصطلاح کو ظاہر کرتے ہیں۔

۳۲۔ دلارے لال بھارگو [Dulare Lal Bhargava]، "ریڈیو براڈکاسٹنگ اور ہندی"، ۱۵۷۔

۳۳۔ ان میں پھلوتی شکلا [Phulvati Shukla]، مہادیوی ورما [Mahadevi Varma]، سرسوتی سریواستو [Sarasvati Srivastava]، کماری نویدیتا مترا [Kumari Nivedita Mitra]، تھورندیوی [Torandevi 'Lali']، شاردامالویہ [Sharda Malviya]، پربھتی بھٹناگر [Prabhavati Bhatnagar] اور کماری ستیہ وتی [Kumari Satyavati] بہ طور خواتین مقرر اور شیام بہاری مشرا [Shyambihari Mishra]، پرشوتم داس ٹنڈن [Purushottam das Tandon]، سمپورن آنند [Sampurnanand]، نریندر دیو [Narendradev]، وشنو پرارکر [Vishnu Pararkar] اور رام چندر شکلا [Ramcandra Shukla] بہ طور مرد مقرر شامل ہیں۔ بھارگو نے ہندی کے جن دیگر بڑے ادیبوں کے نام تجویز کیے ان میں سکھ دیو بہاری مشرا [Sukhdev Bihari Mishra]، دھیریندر ورما [Dhirendra Verma]، دن دیال گپتا [Dindayal Gupta]، رسال [Rasal]، رام کمار ورما [Ramkumar Varma]، ہریودھ [Hariaudh]، میتھلی شرن گپتا [Maithilisharan Gupta]، شریدھر سنہا [Shridharsinha]، چنگلال مالویہ [Changalal Malviya] اور برتھوال [Barthval] شامل ہیں۔

۳۴۔ ڈیوڈ لیلی ولڈ [David Lelyveld]، "Colonial Knowledge and the Fate of Hindustani"، ۶۷۸۔

۳۵۔ دلارے لال بھارگو [Dulare Lal Bhargava]، "ریڈیو اور ہندی"، مشمولہ سُدھا، جلد ۲، شمارہ ۱۳ (مارچ، ۱۹۴۰ء)، ۱۸۲۔

۳۶۔ جیسے Ujjain (اگست ۱۹۴۰ء) کے کھنڈرات پر مضمون کے ساتھ تصاویر / فوٹو گراف اور Ishvardandranand کے لکھے ریڈیو ڈرامے "ہنیری" کو نشر کرتے وقت کاشاٹ (اگست ۱۹۳۸ء)۔ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہونے والے ڈرامے دلارے لال بھارگو کے اشاعت گھر سے دوبارہ اشاعت بھی ہوتی تھی، مثال کے طور پر Govindvallabh Pant کا ڈرامہ "ورملا" اگست ۱۹۳۸ء میں نشر ہوا اور "گنگا گرانتھا گھر" لکھنؤ سے شائع ہوا۔

۳۷۔ وسودھا ڈالمیا[Vasudha Dalmia]، *The Nationalization of Hindu Traditions. Bharatendu Harishchandra and Nineteenth-century Banaras.* (دہلی: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۷ء)۔

۳۸۔ فرانچسکا اورسینی[Francesca Orsini]، *The Hindi Public Sphere, 1920–1940: Language and Literature in the Age of Nationalism.*۔

۳۹۔ ایضاً۔

۴۰۔ شوبنا نجھاوان[Shobna Nijhwan]، *Women and Girls in the Hindi Public Sphere: Periodical Literature in Colonial North India*، (دہلی: اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۲ء)۔

۴۱۔ ان دو اشاعتوں کے علاوہ کلکتہ ریڈیو اسٹیشن نے ۱۹۲۹ء سے (شروع ہونے والے) بنگالی میں *Betar Jagat* شائع کیا، اور پروگرام کا سکرپٹ کلکتہ سے نشر کیا۔ جنوبی ہندوستان میں *Vanoli* تامل میں شائع کیا گیا اور تلگو میں ۱۹۳۸ء میں شروع ہونے والے *Vani* مدراس اسٹیشن کے پروگرام سکرپٹوں کے ساتھ اور دہلی، ممبئ اور کلکتہ اسٹیشنوں سے منتخب پروگراموں کے خلاصے کے ساتھ (شائع ہوتا تھا)۔ انگریزی زبان میں *The Indian Radio Times* ۱۹۲۷ء سے آگے تک جو انڈین براڈ کاسٹنگ سروسز کی جانب سے شائع ہوتا تھا، اسے ۱۹۳۵ء میں دوسرا نام *The Listner* دیا گیا۔ دیکھیے:

لیونل فیلڈن[Lionel Fielden]، *Report on the Progress of Broadcasting in India up to 1939*، xiii، ۱۶۳-۱۶۴۔

۴۲۔ سُدھا کی نشریات کے متعدد شماروں میں ہونے والی غیر متغیر اشاعتِ ثانی پر کام نہ صرف بھارگو نے ذاتی طور پر برج بھاشا کے شاعر رتنکر(Ratnakar) پر کیا بلکہ لڑکیوں کی شرط پر سویتری دیوی بھارگو اور پرتھوی پال سنہا نے اشتہار کی صنعت (کی شرط پر) بھی کیا۔

ڈاکٹر جسور سنہا کی جانب سے گروگوبند کی ہندی شاعری پر تیار کیے گئے ایک ادبی مضمون میں، موضوع کی نوعیت کے مطابق، اردو کی نسبت ہندی الفاظ کا استعمال نسبتاً زیادہ تھا۔ اس کے مقابلے میں راجہ رام موہن رائے کے خطوط پر پروفیسر پربھاکر ماچیو(Prabhakar Machve) کا مضمون جسے آل انڈیا ریڈیو دہلی اسٹیشن سے نشر کیا گیا، واضح طور پر ہندی الفاظ کی نسبت زیادہ اردو الفاظ کا حامل تھا۔

دیکھیے: دلارے لال بھارگو[Dulare Lal Bhargava]، ''ریڈیو اور ہندی''، ۵۵۰-۵۵۳۔

۴۳۔ ڈیوڈ لیلی ولڈ[David Lelyveld]، "Colonial Knowledge and the Fate of Hindustani"، ۶۷۸۔

۴۴۔ دلارے لال بھارگو[Dulare Lal Bhargava]، ''ریڈیو براڈکاسٹنگ اور ہندی''، ۱۵۶۔

۴۵۔ بھارگو کا نقطۂ نظر زوِن(Zivin) کی دلیل کی حمایت کرتا ہے کہ حقیقی ہندوستان کے لیے دیہی نشریات ایک رومانوی منصوبے سے کہیں بڑھ کر ہے اور اسے اس نئی صورتِ حال کی روشنی میں دیکھا جانا چاہیئے جس میں کسان ایک سیاسی عنصر بن چکا ہے۔ دیکھیے:

جوزلین زوِن[Joselyn Zivin]، "The Imagined Reign of the Iron Lecturer: Village Bradcasting in Colonial India"، مشمولہ *Modern Asian Studies*، شمارہ ۳۲، جلد ۳، (۱۹۹۸ء)، ۷۱۹۔

۴۶۔ ان اجلاسات کا انعقاد جنوری، اگست اور دسمبر ۱۹۳۷؛ فروری، اپریل، جولائی اور نومبر ۱۹۳۸ اور مئی اور نومبر ۱۹۳۹ میں ہوا: مزید تفصیل کے لیے دیکھیے:

لیونل فیلڈن[Lionel Fielden]، *Report on the Progress of Broadcasting in India up to 1939*، xii–xiv۔

۴۷۔ لیونل فیلڈن[Lionel Fielden]، *Report on the Progress of Broadcasting in India up to 1939*، xiv۔

۴۸۔ دلارے لال بھارگو[Dulare Lal Bhargava]، ''ریڈیو اور ہندی''، مشمولہ سُدھا، جلد ۲، شمارہ ۱۳ (مارچ، ۱۹۴۰ء)، ۱۸۱۔

۴۹۔ دلارے لال بھارگو[Dulare Lal Bhargava]، ''ریڈیو اسٹیشنوں سے کیسی بولی بولی جانی چاہیے''، ۴۲۱۔

۵۰۔ ایضاً، ۴۲۱-۴۲۲۔

۵۱۔ برج بھاشا کے شاعر کے ادبی کارنامے بھارگو کے ریڈیو نشریات کے ایک پروگرام کا موضوع رہے ہیں۔

۵۲۔ دلارے لال بھارگو[Dulare Lal Bhargava]، ''ریڈیو اسٹیشنوں سے کیسی بولی بولی جانی چاہیے''، ۴۲۲۔

۵۳۔ سجاتا مودی[Sujata Mody]، " Literary Self-determination and the Disciplinary Boundaries of Hindi Literature in the Early Twentieth Century"، مشمولہ *South Asia Research*، جلد ۳، شمارہ ۳۲(نومبر، ۲۰۱۲ء)، ۲۳۳-۲۵۶۔

۵۴۔ دلارے لال بھارگو[Dulare Lal Bhargava]، ''ریڈیو اسٹیشنوں سے کیسی بولی بولی جانی چاہیے''، ۴۲۱۔

۵۵۔ ولیم گولڈ[William Gould]، " Congress Radicals and Hindu Militancy: Sampurnaanand and Purushottam Das Tandon in the Politics of the United Provinces, 1930-1947"، مشمولہ *Modern Asian Studies*، جلد ۳، شمارہ ۳۶(جولائی، ۲۰۰۲ء)، ۶۱۹-۶۵۵۔

۵۶۔ لیونل فیلڈن[Lionel Fielden]، *Report on the Progress of Broadcasting in India up to 1939*، xii۔

۵۷۔ جے۔ آر۔ فرتھ[John Rupert Firth]، "Alphabets and Phonology in India and Burma"، مشمولہ *Bulletin of the School of Oriental Studies*، جلد ۲-۳، شمارہ ۸(۱۹۳۶ء)، ۵۱۸۔

۵۸۔ بیورلی کولنز[Beverly Collins]/ اینگر میس[Inger Mees]، *Daniel Jones, Selected Works.*، جلد ۷، (منتخب پرچے)، (لندن: روٹلیج، ۲۰۰۲ء)، ۱۱۔

۵۹۔ چارلس کے آگڈن[Charles Kay Ogden]، *Basic English: A General Introduction with Rules and Grammar. Revised Edition*(نیویارک: ہارکورٹ، بریس اینڈ ورلڈ، ۱۹۶۸ء[۱۹۳۰ء])۔

۶۰۔ ستیہ پرکاش[Satya Prakash]، ''مُل ہندی یا بیسک ہندی''، مشمولہ سُدھا، جلد ا، شمارہ ۱۴(اگست، ۱۹۴۰ء)، ۱۷-۲۴۔

۶۱۔ ایضاً، ۱۸۔

۶۲۔ ایضاً، ۱۱۹۔

۶۳۔ صوبہ ہائے متحدہ (United Provinces): برطانوی ہند کا ایک صوبہ جو صوبہ ہائے آگرہ اور اودھ کا نام تبدیل کرنے سے ۳ جنوری ۱۹۲۱ کو وجود میں آیا۔ https://en.wikipedia.org/wiki/United_Provinces_of_Agra_and_Oudh، (۱۰ مارچ ۲۰۲۲ء)۔

۶۴۔ دلارے لال بھارگو[Dulare Lal Bhargava]، ''ریڈیو اسٹیشنوں سے کیسی بولی بولی جانی چاہیے''، ۴۲۲۔

۶۵۔ ایضاً، ۴۲۳۔

۶۶۔ ستیہ پرکاش[Satya Prakash]، ''مُل ہندی یا بیسک ہندی''، مشمولہ سُدھا، جلد ا، شمارہ ۱۴(اگست، ۱۹۴۰ء)، ۲۳۔

۶۷۔ ایضاً، ۲۱۔

۶۸۔ ڈیوڈ لیلی ولڈ[David Lelyveld]، "Colonial Knowledge and the Fate of Hindustani"، ۶۷۹۔

۶۹۔ دلارے لال بھارگو[Dulare Lal Bhargava]، ''ریڈیو اور ہندی''، مشمولہ سُدھا، جلد ۲، شمارہ ۱۳(مارچ، ۱۹۴۰ء)، ۱۸۲۔

۷۰۔ جیسے manovaijnanik shabd-vala(''پُرکشش لفظ'') اور vicar-mitra(''شریکِ رائے'')۔ دیکھیے: رمیشورناتھ مشرا[Rameshvarnath Mishra]، ''ہندی، اردو اور ہندوستانی یا راسٹر بھاشا کا پرشنا''، ۵۲۵-۵۲۸۔

۷۱۔ ڈیوڈ لیلی ولڈ[David Lelyveld]، "Colonial Knowledge and the Fate of Hindustani"، ۶۷۹۔

# Bibliography


Ahmad, Z.A. "Hindūstānī az Mahātamā Gāndhī" In *Qaumī Zabān*. Translated by Moeen Ijaz. New Dehli: National Council for Promotion of Urdu Language, 2021.

Ahmad, Z.A. "Javāhar Lāl Nehrū" In *Qaumī Zabān*. Trans. by Moeen Ijaz. New Dehli: National Council for Promotion of Urdu Language, 2021.

Baruah, U.L. *This is All India Radio: A Handbook of Radio Broadcasting in India*. Delhi: Publications Division, Ministry of Information and Broadcasting, Government of India. 1983.

Bhargava, Dularelal. "Radio aur Hindī", In *Sūdhā* 13, no. 2, 181-182. 1941.

Bhargava, Dularelal. "Radio aur Hindī", In *Sūdhā* 14, no. 6, 592–594. 1941.

Bhargava, Dularelal. "Radio kī Hindī (Radio Hindī)", In *Sūdhā* 13, no. 3, 285. 1940.

Bhargava, Dularelal. "Radio-Broadcasting aur Hindī", In *Sūdhā* 12, no. 1, 156–157. 1938.

Bhargava, Dularelal. "Radio-stationoṅ sē kēsī bolī boli jānī chahiyē?", In *Sūdhā* 14, no. 3, 421–425. 1940.

Collins, Beverly and Mees, Inger. *Daniel Jones, Selected Works*. Vol. VII (Selected Papers). London: Routledge, 2002.

Dalmia, Vasudha. *The Nationalization of Hindu Traditions. Bharatendu Harishchandra and Nineteenth-century Banaras*. Delhi: Oxford University Press, 1997.

Fielden, Lionel. *Report on the Progress of Broadcasting in India up to 1939*. Shimla: Government of India Press, 1940.

Firth, J.R. "Alphabets and Phonology in India and Burma", In *Bulletin of the School of Oriental Studies* 8, no. 2/3, 517–546. 1936.

Gould, William. "Congress Radicals and Hindu Militancy: Sampurnanand and Purushottam Das Tandon in the Politics of the United Provinces, 1930–1947", In *Modern Asian Studies* 36, no. 3, 619–655. 2002.

https://eap.bl.uk . Accessed May 31, 2022.

https://en.wikipedia.org/wiki/United_Provinces_of_Agra_and_Oudh. Accessed July 21, 2022.

Kumar, Kanchan. "Mixed Signals: Radio Broadcasting Policy in India", In *Economic and Political Weekly* 38, no. 22, 2173–2182. May-June 2003.

Lelyveld, David. "Colonial Knowledge and the Fate of Hindustani" In *Comparative Studies in Society and History* 35, no. 4, 665–682. Oct 1993.

Lelyveld, David. "Upon the Subdominant: Administering Music on All-India Radio", In *Social Text* 39, 111–127. 1994.

Mishra, Rameshvarnath. "Hindī, Ūrdu aur Hindūstānī yā Rashtrā-Bhāshā kā Prashnā" in *Sūdhā* 14, no. 4, 525–528. November 1940.

Mody, Sujata. "Literary Self-determination and the Disciplinary Boundaries of Hindi Literature in the Early Twentieth Century", In *South Asia Research* 32, no. 3, 233–256. November 2012.

Nijhawan, Shobna. *Women and Girls in the Hindi Public Sphere: Periodical Literature in Colonial North India*. Delhi: Oxford University Press, 2012.

Ogden, Charles Kay. *Basic English: A General Introduction with Rules and Grammar. Revised Edition.* New York: Harcourt, Brace & World, (1968 [1930]).

Orsini, Francesca. *The Hindi Public Sphere, 1920–1940: Language and Literature in the Age of Nationalism*. Delhi: Oxford University Press, 2002.

Pinkerton, Alasdair. "Radio and the Raj: Broadcasting in British India (1920–1940)", In *Journal of the Royal Asiatic Society* 18, no. 2, 167–191. April 2008.

Potter, Simon J. *Broadcasting Empire: The BBC and the British World, 1922–1970*. Oxford: Oxford University Press, 2012.

Satyaprakash. "Mul Hindī yā basic Hindī", In *Sūdhā* 14, no. 1, 17–24. August 1940.

Stark, Ulrike. *An Empire of Books: The Naval Kishore Press and the Diffusion of the Printed Word in Colonial India.* New Delhi: Permanent Black, 2007.

Zivin, Joselyn. "The Imagined Reign of the Iron Lecturer: Village Broadcasting in Colonial India", In *Modern Asian Studies* 32, no. 3, 717–738. 1998.